دھوپ کا لباس
یامین

# دھوپ کا لباس

یامین

# دھوپ کا لباس

یامین

مطبوعاتِ نقاط

# Dhoop ka Libaas

[Urdu Poems]

**Yameen**

شاعر: یامین

رابطہ: پوسٹ بکس نمبر 203، جی پی او مظفر آباد

yaminesma@yahoo.com

92-0345-5322619

سرورق: زیف سید

تزئین: سلیم پاشا

مطبع: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت: جون ۲۰۱۲ء

قیمت: ۳۰۰ روپے/۳۰ ڈالر امریکی

زیرِ اہتمام: مطبوعاتِ نقاط، اسلام آباد، فیصل آباد

niqaat@gmail.com
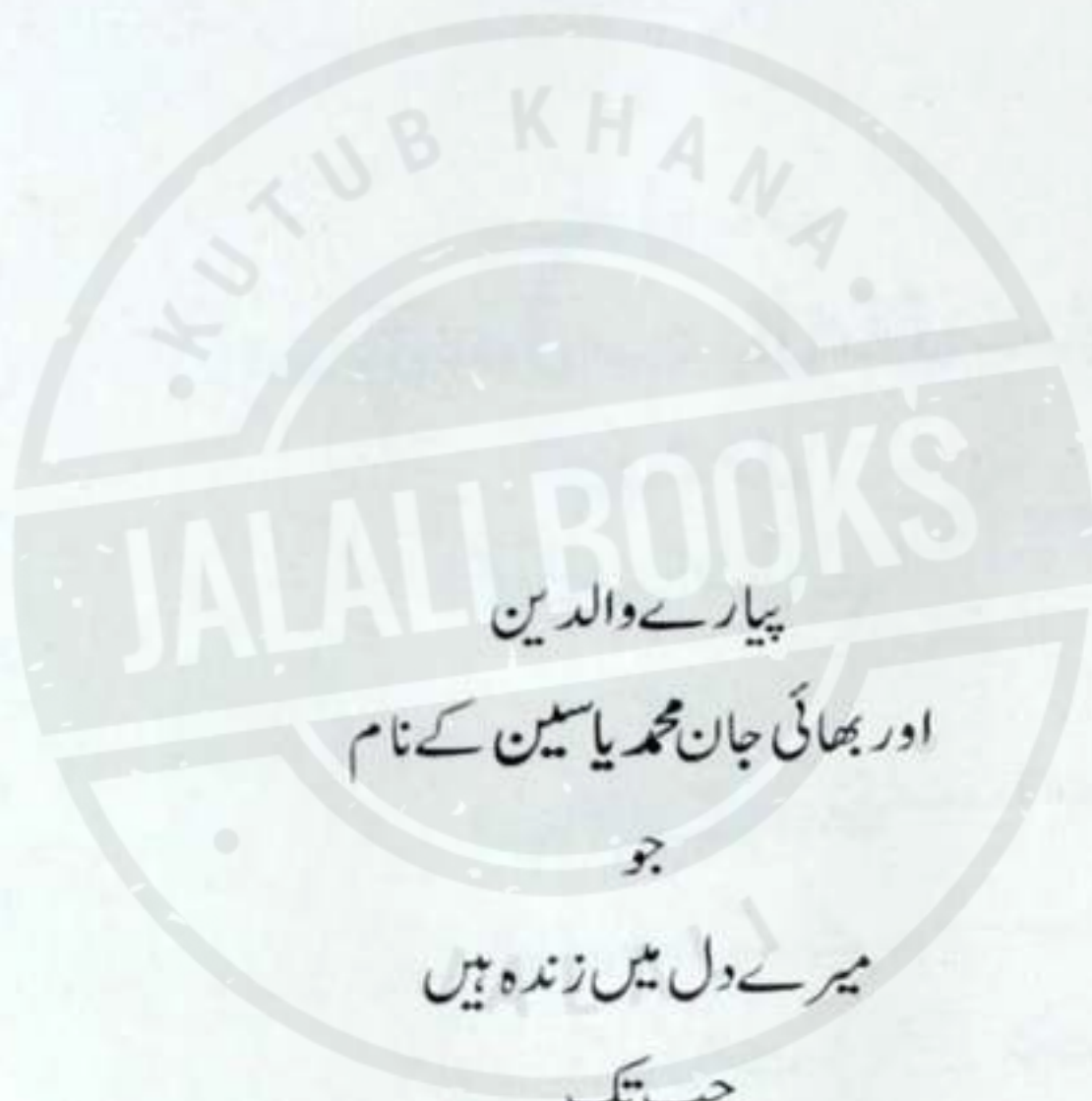
پیارے والدین

اور بھائی جان محمد یاسین کے نام

جو

میرے دل میں زندہ ہیں

جب تک

میں زندہ ہوں

اپنے ادبی اساتذہ

جناب ساقی فاروقی اور جناب علی محمد فرشی کے لیے

جن کی شاعری

مجھے لکھنے پر اکساتی ہے

اور

اپنے بچپن کے دوست

الیاس ملک کے لیے

جس کی محبت

مجھے زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے

# فہرست

# عقیدت

کاش میں پیڑ کھجور کا ہوتا حجرے کا ہمسایہ
ہر موسم نذرانہ کرتا اپنا پھل اور سایہ

گم ہو جاتا مٹی میں جب میرے نام کا دانہ
تپتی خاک میں مل کر بنتا میں انمول خزانہ

جس نے اپنے دل کے اندر آپ کی پیت سنبھالی
اس کے آگے دنیا کیا ہے، کیا رتبہ، خوش حالی

# کلام
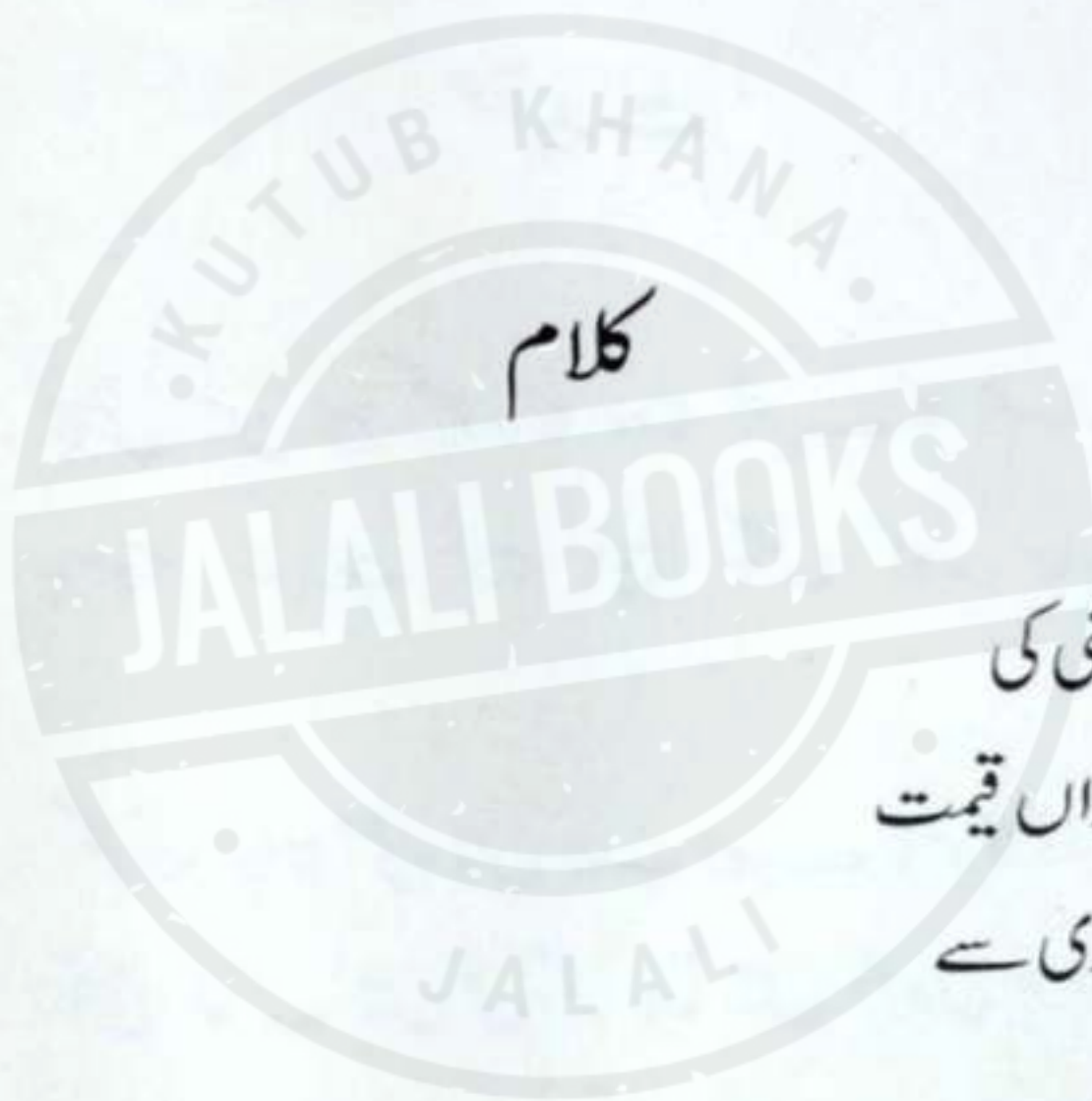


خموشی کی
گراں قیمت
بلندی سے
گر
ی
آواز

# راج محل کا چڑیا گھر

دن تو سارا

رٹے رٹائے جملے بولتے کٹ جاتا

رات آتی تو

راج محل کے چڑیا گھر میں

دیس بہ دیس کے توتے

اپنے اپنے کُنجِ قفس میں

لال کھجوروں کا بغداد

اور مہکتے سیبوں کا کشمیر جگا کر سوتے

اپنے پھولوں
اور باغوں کی یاد میں
چھپ کر روتے

روتے تھے ان وقتوں کو
جب سارے میں خیریت تھی
سارے سرخ و سبز اچھے تھے
جب یہ اپنے (باغوں والے) ہم جنسوں پر
رعب جما کر کہتے
اس پنجرے میں
کیسی کیسی باتیں ہم نے سیکھیں
توتا چشمی جیسا فن ایجاد کیا
اور مہذب قوم کی دل کش بولی سیکھی
اس بولی کے اچھر جب سے بول رہے ہیں
اپنی یہ تلوار زباں رُکتی ہی نہیں
ان پھر پھر گھومتی آنکھوں نے کیا دیکھ لیا

اب یہ نظر تو
اور کہیں ٹکتی ہی نہیں
پنجرے کی دُنیا کے سوا
کوئی اور جگہ دکھتی ہی نہیں
ان میں سے کچھ
دھیمی دھیمی ٹیں ٹیں کرتے
اور یہ باتیں سُن کر ہنستے
کہتے ......
ان نادانوں نے
آخراب تک کیا بولا ہے
ایک میاں مٹھو کے سوا
ان پھر پھر گھومتی آنکھوں نے
آخراب تک کیا دیکھا ہے
اپنے ہی آنسو کے سوا

پنجرے کے ظلمات میں بیٹھا

اک ہریالا بول رہا ہے
آج مجھے
بصرے کی میٹھی لال کھجور کا
تحفہ کون کھلائے
مٹی تیل سے چڑیا گھر کی
بتی کون جلائے
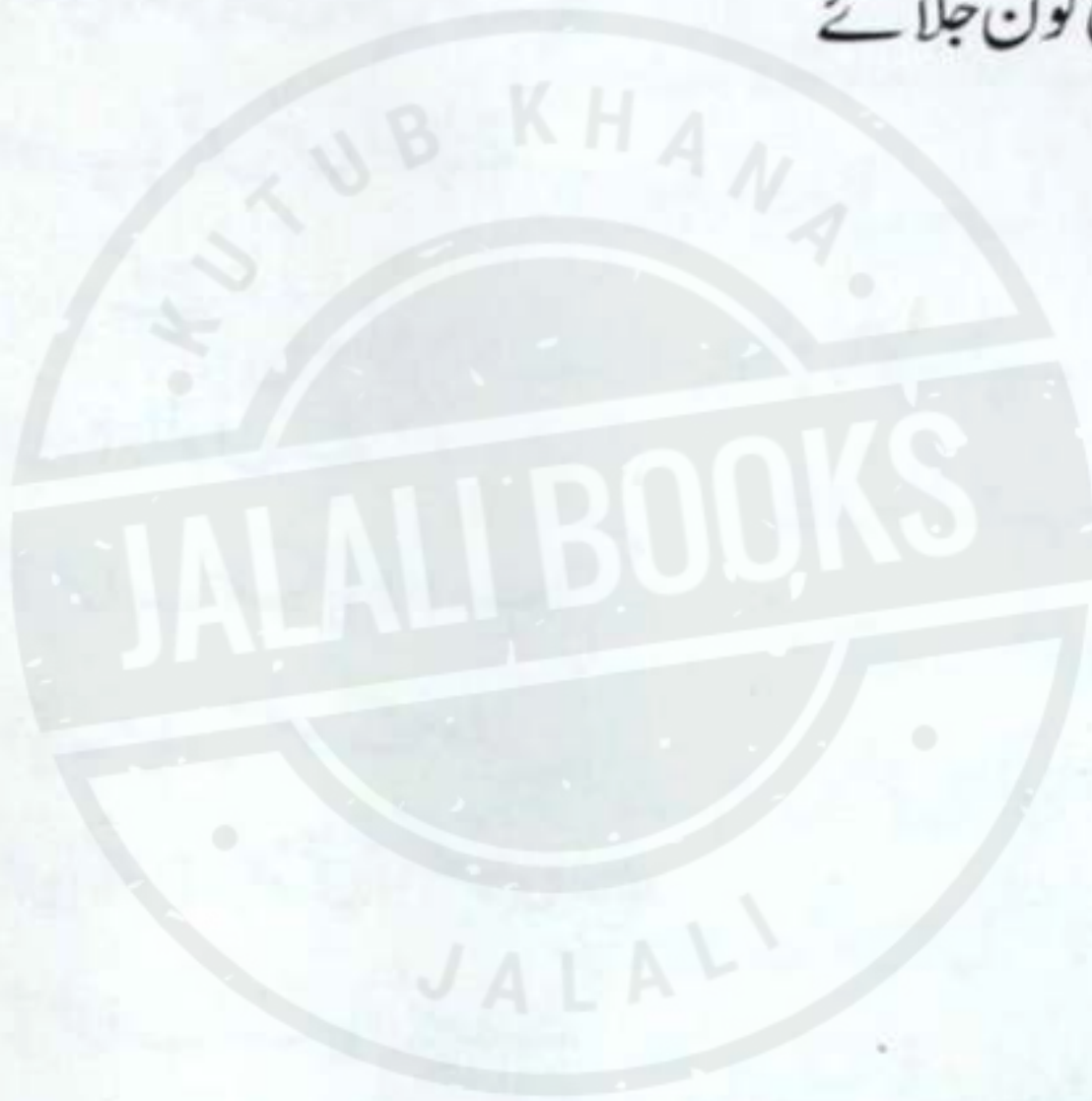
## افسوس

مگر ہم نے دیکھا
کہ ویران گھاٹی کا دامن بھرا تھا
بہت ساری چیزیں
ہواؤں کے پاؤں سے اُلجھی ہوئی تھیں
دعاؤں کی
خالی اور اُوندھی پڑی شیشیاں
(اور ٹوٹی ہوئی) پنج گانہ نمازیں

نوافل وصیّام کی سخت ڈھالیں
مساجد کے رستوں میں توڑی گئی
جوتیوں
اور قدم در قدم
نیکیوں کی قطاریں
وظائف و وِرد و مناجات کے
اک ربن میں بندھے
خداوند عالم کی رسی کے ٹکڑے
اور ایسی بہت ساری چیزیں
خدا کی خدائی میں بکھری ہوئی تھیں
کہ جیسے یہاں
رات ٹھہرے ہوئے کارواں کو
اب ان کی ضرورت نہ تھی
کہ بخشش کا خالی کنستر
بہت بھر گیا تھا
مگر نیک ناموں کی پھینکی ہوئی

بہت ساری چیزوں کے
اس ڈھیر میں
کوئی ہمسائے کا درد......
اس پر بہایا گیا گرم آنسو نہیں تھا
کوئی بھوک کو کاٹنے والا دل دار چاقو نہیں تھا
سخاوت کا خاموش ہاتھ
اور شقاوت پہ اٹھتا ہوا کوئی بازو نہیں تھا
بہت ساری چیزیں تھیں
لیکن کہیں بھی ترازو نہیں تھا

# ستارے کو ستارے کی خبر ہے

اسد سنبلہ کے پیچھے ہے
شکاری شیر کے آگے کھڑا ہے
یہ چار آنکھیں
یہ دو چہرے
برابر آگئے تو
حادثہ شاید
کسی تقویم سے بھی
ٹل نہیں سکتا

# آپ جناب

صبح سویرے
پورے دن کے کام
دماغ میں آئے
ایک احساس کو توڑ کے
باہر کھلی سڑک پر نکلے
دو پہیے دوڑائے
چکرائے

دفتر دفتر عرضی گھوم کے
پہنچی ایک ٹھکانے

نامنظوری کی اک میز پہ اپنے زخم سجانے

کون سنے افسانے

آدھی چھٹی ساری کر کے

چلے گئے سب لوگ

اک دن اور اس دل کے اندر

لگا، لگانے روگ

تپ کر تیز بخاری درجہ

اک سو چار دکھائے

غصہ میز پہ تھوک کے پھر سے

دو پہیے دوڑائے

سب رستے سنسان پڑے تھے

بھاگ رہے تھے سائے

دھوپ دوپہری پچھل پیری نیم تلے ستائے

خوف نے ایسی نظریں باندھیں

جل جل جان ڈری
شاہی مسجد کے دالان میں ظہر نماز پڑھی
عصری وقت خسارے والا جانے کیسے گزرا
سورج نے سنسار کو دیکھا اور کیا پرنام
نازل ہو گئی شام

شام اک پل کا جوبن دیکھ کے نکلی دیس پرائے
رات رسول کی منت مانی
چار چراغ جلائے
اپنا تخت سنوار کے بیٹھے
تنہا
آپ جناب
پچھلے پہر کی رات تھی
اور ٹوٹے پھوٹے خواب

## آدھی رات کا منتر

یہ سایہ تو
میرے ہی اندر سے نکل کر
بھاگ رہا ہے
مائی
تم یہ کیا چھنکاتی ہو
اَدھا بھائیا جاگ رہا ہے

# پچھل پیری

دوپہر سنسان تھی
بور کی مستی سے مہکے
آم کے اک پیڑ کے نیچے
مچلتی لڑکیاں
خواب جن کے
ایسے خالی برتنوں کی طرح بجتے تھے
کہ جو تانبے کے ہوں
اور دھوپ میں یوں دُور سے چمکیں
کہ جیسے بجلیاں

ایک......جس کی آنکھ
کچے آم کی اک پھانک تھی
اپنے دل کی بات
(جو اک رات میں لپٹی ہوئی تھی)
کھولنے بیٹھی
کلیجا کانپ اٹھا
''وہ مجھے ندی کے نیلے پانیوں پر
دھوپ کی مانند پھیلے دیکھ کر
یوں ہنس پڑا تھا
جیسے اس کی قبر پر
ہنستے ہیں آج
دودھیا نرگس کے پھول
ایک دن کے زوج میں
اور عمر بھر کے روگ میں
لپٹی ہوئی
میں تھی اور بستر کا کونا

ایک نیزے کی طرح چبھتا رہا
سخت باتیں
بند کمرے میں برہنہ بددُعاؤں کی طرح
چلنے لگیں
آنکنوں کی گود بھریاں
میرے چھدرے سائے سے
ڈرنے لگیں
رفتہ رفتہ جسم کے اندر
ہزاروں تتلیاں جلنے لگیں
اور پھر اک رات
آنکھیں پھٹ پڑیں
اور جسم دُھرا ہو گیا
پاؤں میرے......"

سب نے اس کے پاؤں کی جانب نظر کی
اور چیخیں مار کر

سب کی سب

اس طرح بھاگیں

کہ جیسے

جنگلوں کی وحشتوں کے

درمیاں

اپنے ہی پاؤں کی آہٹ

سُن کے بھاگیں

ہرنیاں
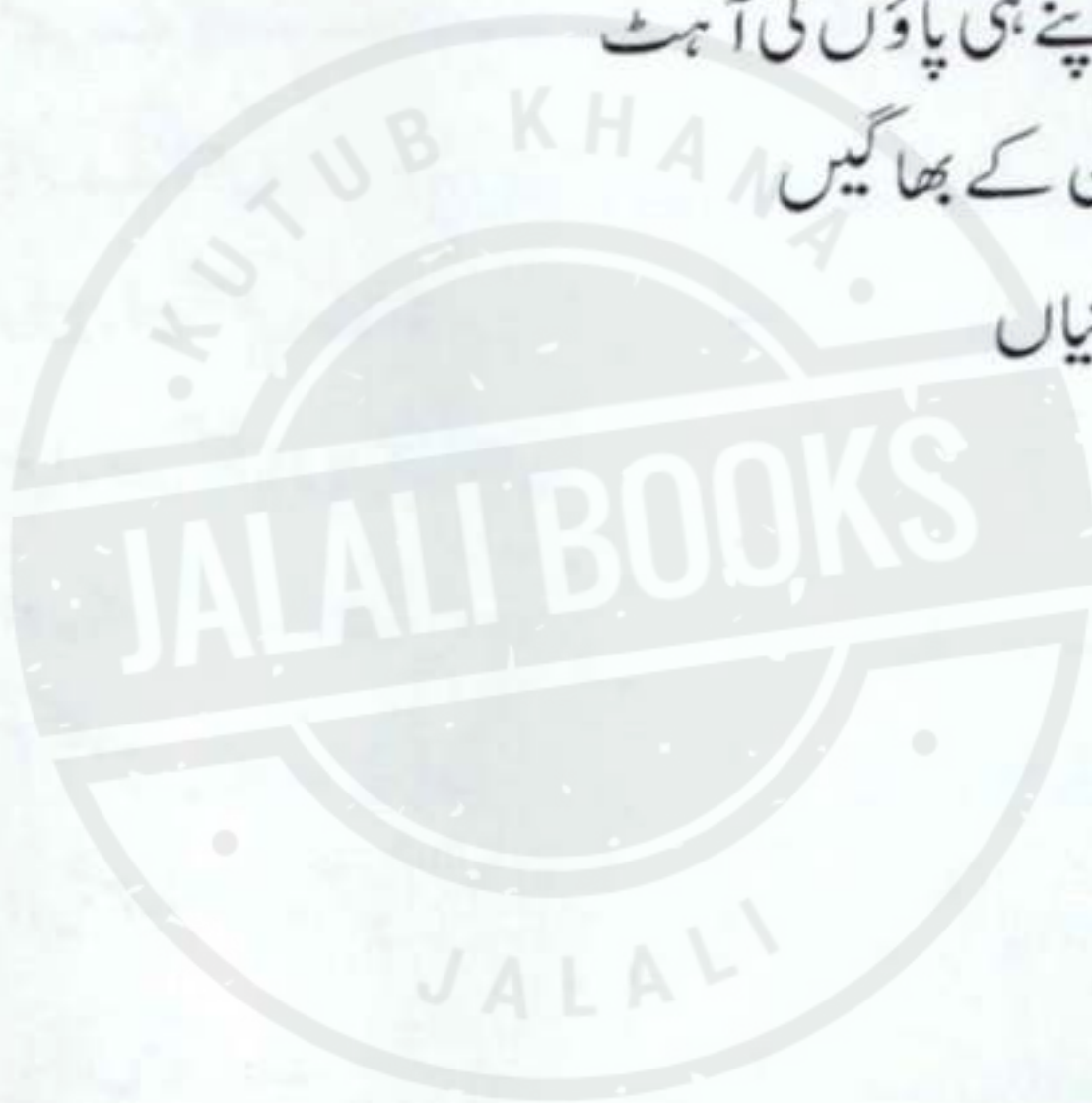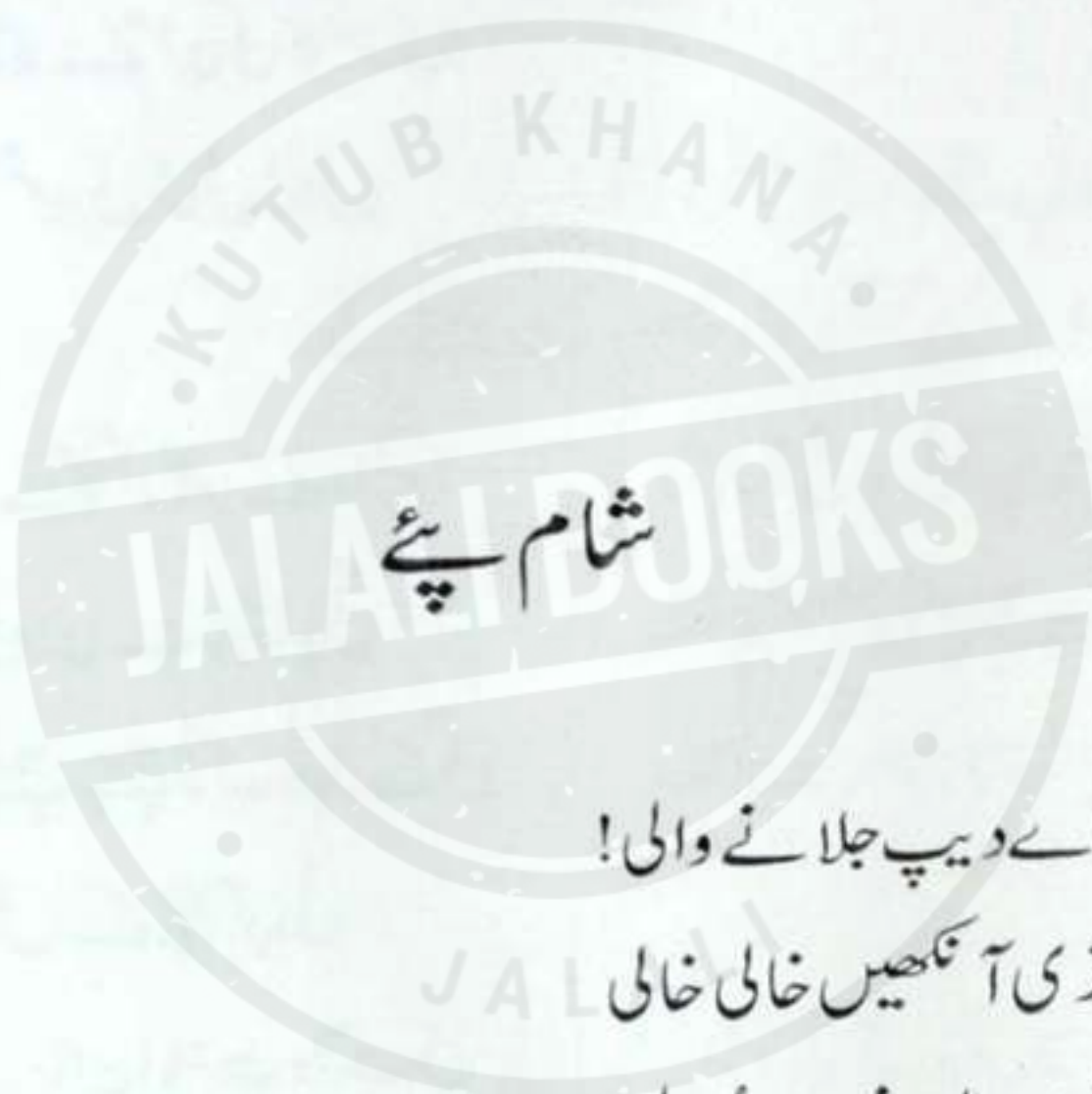
## شام پہ

اے دیپ جلانے والی!
تری آنکھیں خالی خالی
تُو ان میں خواب اُجال
یہ دنیا شام پہاڑ کی
رکھ اس پر چاند کا تھال

اے گیت سنانے والی!

کوئی دِل کی بات سُنا

اس گھر کو آگ لگا

ترے ساون بادل بال

برفیلے گال گلال

سلگا لے من کی کانگڑی

کشمیر کی شال نکال

اے گاگر بھرنے والیو!

جیون ہے بہتا پانی

بہتے بہتے رُک جائے گی

دل کے بیچ کہانی

یہ جان امانت وقت کی

پھر روز روز کیا مرنا

"شام پئی بن شام محمد

گھر جاندی نے ڈرنا"

# قیدی

پھول تھے اور قہر خوش بو کا
خوف کے گھنگھرو چھن سے بجنے لگے
چاندنی کو فروغ تھا اتنا
رات بھر اس طلسم کا فتنہ
سر اٹھا تا رہا مرے اندر

سحر میں قید۔ آرزو میں گم
سب کے سب ہم
سب کے سب تم
جان جوکھوں میں ڈال کر نکلے

اک کشادہ مکان کی چھت پر
نرگسی چہرے بال کھولے ہوئے
ماتمی سُر میں گیت گاتے ہوئے

اپنا تو دل ہی کانپ جاتا ہے
اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی
جس کی خوش بُو پہ سانپ آتا ہے
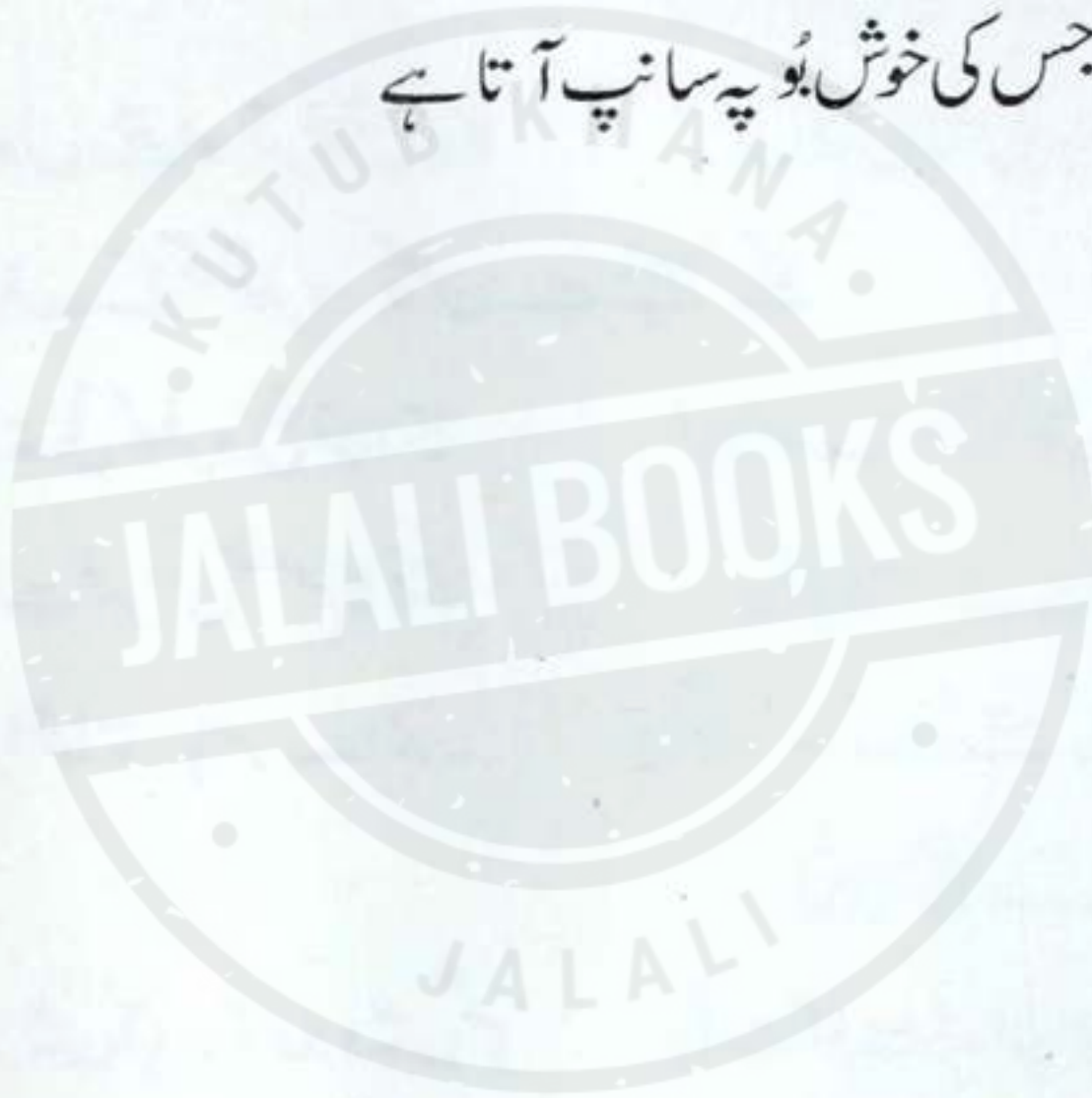
# بٹن

جلتی رات میں
اس کی سبز قمیص کے اندر
جانے کیا شے
کانپ رہی تھی

کالر سے نیچے
سینے پر اک
سارس رنگ کا
اجلا بٹن اُگ آیا تھا
جیسے کوئی مشروم
ننھی ٹوپی سر پہ جمائے

تھلمل کرتے کھیت کے
سینے سے نکلی ہو

وہ جو کتنے ہی برسوں سے
خود سے بے گانہ تھی
اس دن سے روزانہ
اپنے ہاتھ کی ایک انگلی میں
سرخ گلاب جلا کر
کمرے میں ہر جانب پھیلے
گھور اندھیرے کے بالوں میں
سن سن آگ لگا کر
باہر آ کر
اپنی آنکھیں گیٹ کے اوپر
بلب بنا کر
رکھ دیتی ہے

# سال گرہ

یاد نہیں کیا
بھرے پُرے بازار سے جب میں
خالی خالی لوٹ آیا تھا
اور اک پھول
تیرے چمکتے ہاتھ پہ رکھ کر
میں نے کہا تھا
تیری پسند کے رنگ کا کپڑا
مل نہ سکے تو
میرے کوٹ کی
جیب میں رکھے
نوٹ کی
قیمت گر جاتی ہے

# سپردگی

اس نے
اپنی سوندھی سوندھی
مٹی گوندھی تھی
اور عجب سرشاری سے
پیار کے چاک پہ رکھ دی تھی
میں اپنے دونوں ہاتھوں کی
پوروں میں جاگ اٹھا تھا

# چنبیلی

اے شہزادی
پکی اینٹوں والے صحن کے
اس کونے میں
میں نے برسوں
تم کو پاگل حیرانی سے
اپنی پوری نادانی سے دیکھا ہے

کب تک یوں ہی
سر کو جھکائے
سبز لباس میں
اپنی بے کل باس چھپائے

کھڑی رہو گی

اوپر دیکھو

ہاتھ بڑھاؤ

اپنی خوش بُو میں کچھ بولو

کلیاں کھولو

دیکھو!

تمھاری ہمسائی

بوگن کی یہ بیل

آج گلی میں کھیل رہی ہے

# ایک شام چائے پر

ایک شام چائے پر
بات پھر وہ چل پڑی
اُٹھ کے درمیان سے
وہ کہیں نکل گئی

دس برس گزر گئے
بے تکان زندگی
پُر تکان ہو گئی
اس کے اک خیال سے
میں گمان ہو گیا
وہ مرے حساب سے
ایک دھیان ہو گئی

آج ایک شام ہے
چائے خانے میں وہی
تیز تیز باس ہے
دل بہت اداس ہے

خامشی کے نصف میں
گفت گو خیال کی
گم شدہ سوال کی

پھر کسی گمان سے
صرف ایک دھیان سے
کوئی بھی نہیں رہا
اٹھ کے جو نکل پڑے
آج درمیان سے

## دو طرح سے

دو طرح کے ہیں بدن
دو طرح کے پیرہن
اک سجل بے رنگ ریشم سا لباس
جس میں لپٹا میرا فن
جس میں پلتے ہیں خیال

اک طرح کا پیرہن
تازہ اُجلے سوت کا
جس میں رکھا ہے بدن
اور میرے خط و خال

پیرہن اوپر کا اُترے
تو پہن لوں میں کسی دیوار کو
یا گماں کو چھوڑ کر
میں یقیں کو اوڑھ لوں

پیرہن اندر کا اُترے
اور ہوں میں بے لباس
آگہی کو ڈھونڈ کر میں
اس زمیں کو اوڑھ لوں

# چیونٹیاں

رات بھر
کپکپاتے ہوئے
جسم پر
اک لکیر
ہانپتی، کانپتی، سنسناتی رہی

## اُلٹی گنگا

وہ اُلٹی شلوار پہن کر
لوگوں سے یہ کہتا ہے
سرکار بھی اُلٹی ہے

شلوار بھی اُلٹی ہے

# گل حسنا

ملک صاحب کے گھر سے
اس کو فرصت تو نہ ملتی تھی
مگر پھر بھی
وہ جانے کتنی دوپہروں
کئی مصروف شاموں سے
چُرایا وقت لے کر آ نکلتا تھا
گھروں گلیوں میں پھرتا تھا

وہ ہر گھر میں
ذرا سی دیر رکتا

چائے پیتا اور

فرمائش پہ لوگوں کو ہنساتا

جو کوئی بوڑھی دادی ماں

اسے کچھ کام کہہ دیتی

تو وہ سینے پہ اپنا ہاتھ رکھ کر

یہ کہا کرتا

نہیں جی...... کیوں نہیں......

آخر...... محلے بھر کا خادم ہوں

ملک صاحب کے ابا جان

ستر سال سے اوپر تھے

جب گھر میں چھپی تنہائی

تن کر سامنے آتی

تو وہ یک دم بکھر جاتے

یہی وہ وقت ہوتا

جب حسن (جس کو سبھی گل حسنا کہتے تھے)

انھیں پھر بے وفا دُنیا میں

لے آتا

اور آتے ہی

سیاسی تبصروں کو

کچھ اپنی فہم کا تڑکا لگا کر

پیش کر دیتا

''یہ بھا شانی

عجب منطق کا بندہ ہے

اور اس کے ساتھ

باچا خان کو دیکھو...... ہمہ وقت اس ریاست کی

خداداد پہ حرفِ نامرادی لکھتا رہتا ہے

سنا ہے سیز فائر ہونے والا ہے

مگر اپنا یہ دیسی توپ خانہ تو کبھی خاموش نہ ہوگا''

یہ کہہ کر

مسخروں کی طرح وہ

بازو ہلاتا

ناچ کر اک جست بھرتا
اور ہوا کا ایک گولا داغ دیتا تھا

(خدا بخشے) ملک صاحب کے ابا جان
اپنی بے ارادہ مسکراہٹ کو چھپانے کی سعی کرتے
اور اس کو گالیاں دیتے
مگر اندر سے کہہ دیتے
اگر بدصورتی سے کوئی صورت حُسن کی نکلے
تو اس میں کیا برائی ہے

کئی برسوں کے بعد اک بار
پھر ایسا ہوا
اپنے ملک صاحب اکیلے ہیں
جواں بیٹے
سمندر پار ملکوں میں گئے ایسے
کہ پھر واپس نہیں آئے

اگر چہ پیسے ویسے کی کمی ان کو نہیں
شاید ضرورت اور شے کی ہے
اکیلے اپنے بستر پر
پڑے یہ سوچتے ہیں
ہم بھی ہنستے تھے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
ہمیں ہنسنا نہیں آیا
نہ جانے کتنے برسوں سے
ہمارے گھر میں...... گل ہنسنا نہیں آیا

## Rain Drops
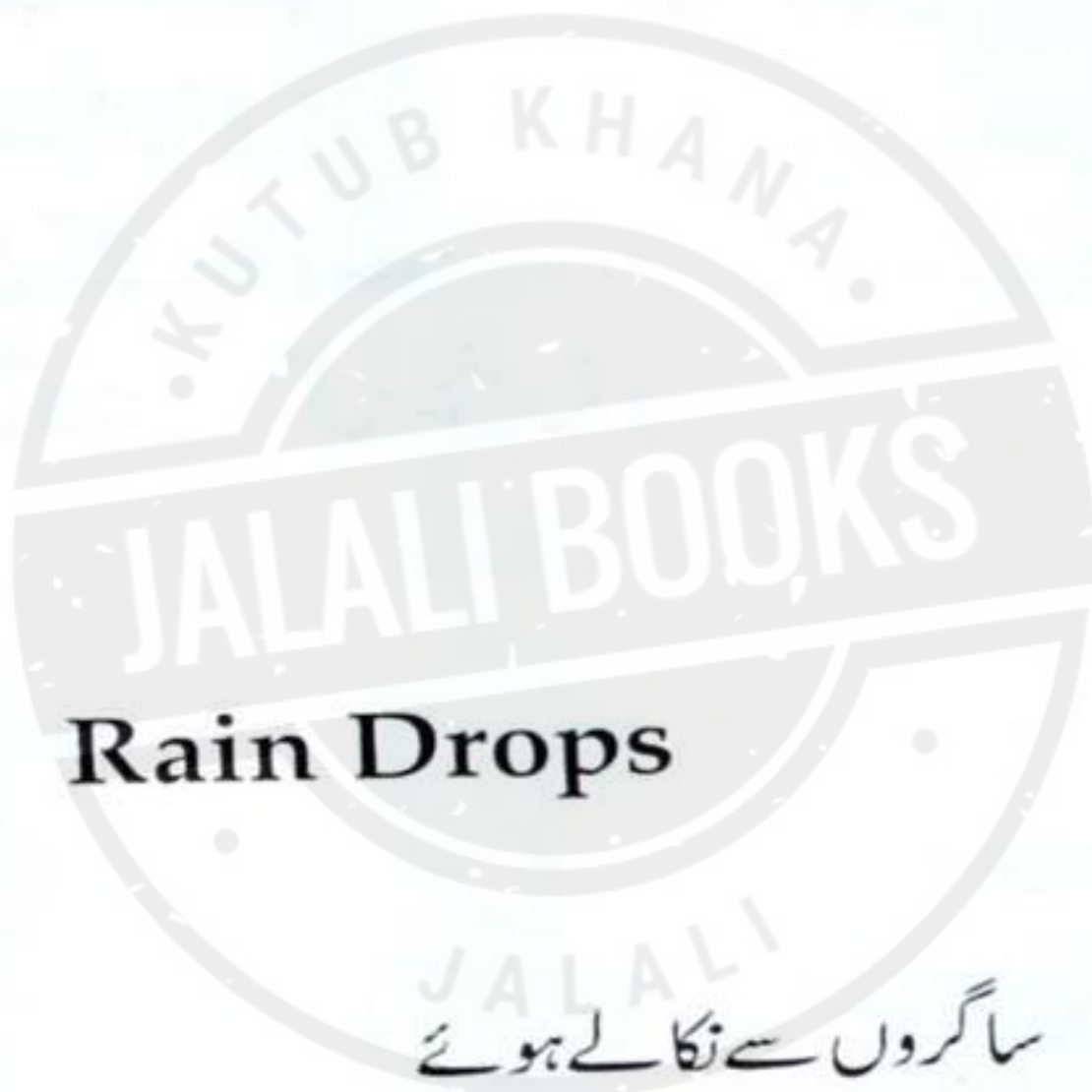
ساگروں سے نکالے ہوئے

موتیوں کے بدن

بادلوں نے سنبھالے ہوئے

# رہائی

مسجدوں کی سیڑھیوں سے
باری باری
سب بھکاری اُٹھ گئے تھے
شہریوں کو
اپنے اپنے
گھر کے کونوں میں
نمازِ خوف سے فرصت نہ تھی
ہر ایک کو
اپنی طرح کے
دوسرے کا خوف تھا

آسماں سے
کب کوئی سیڑھی گری
کس بلا نے پاؤں رکھے شہر میں......

لوگ اپنی
روزمرہ گفت گو کو چھوڑ کر
انگلیوں سے باتیں کرتے
اور اپنی پیاری جانوں کے لیے
خیراتیں کرتے تھے
کہ گویا

یہ بے چارے
زندگی سے بدگماں ہوں
ایسا لگتا تھا کہ جیسے
ان کی اس لاغر زمیں کے دوش پر
سات ظالم آسماں ہوں

ایک دن
اس شہر کے حاکم نے
ان کے نام
اپنے نشریے میں

ان کی جانوں کے تحفظ کی قسم بھی کھائی تھی

شام نازل ہو رہی تھی
چوک میں پھر خوف کا جنگل اُگا
کھلبلی مچنے لگی
بادلوں کے قافلے
آندھیوں کے کالے گھوڑوں پر سوار
اُڑنے لگے
بس
اسی اک آن میں
اک شخص
جس کے بال جھاڑی کی طرح تھے
اور آنکھیں
جیسے اندھے بلب ہوں ٹوٹے ہوئے
اک گلی کے موڑ سے ظاہر ہوا
اور اس نے

ان میں سے اک شخص کو

اپنے بھدے

سخت ہاتھوں سے دبوچا

لمبے لمبے ناخنوں سے

اس کا سینہ چھید کر

اپنی بے کل روح کے ہر زخم کو

مندمل کرنے لگا

اک بھیانک چیخ میں

وہ اپنا خوف اس آدمی میں

منتقل کرنے لگا

شہر کے ہنگام سے

بے خبر

آرام سے مرنے لگا

## مقدر
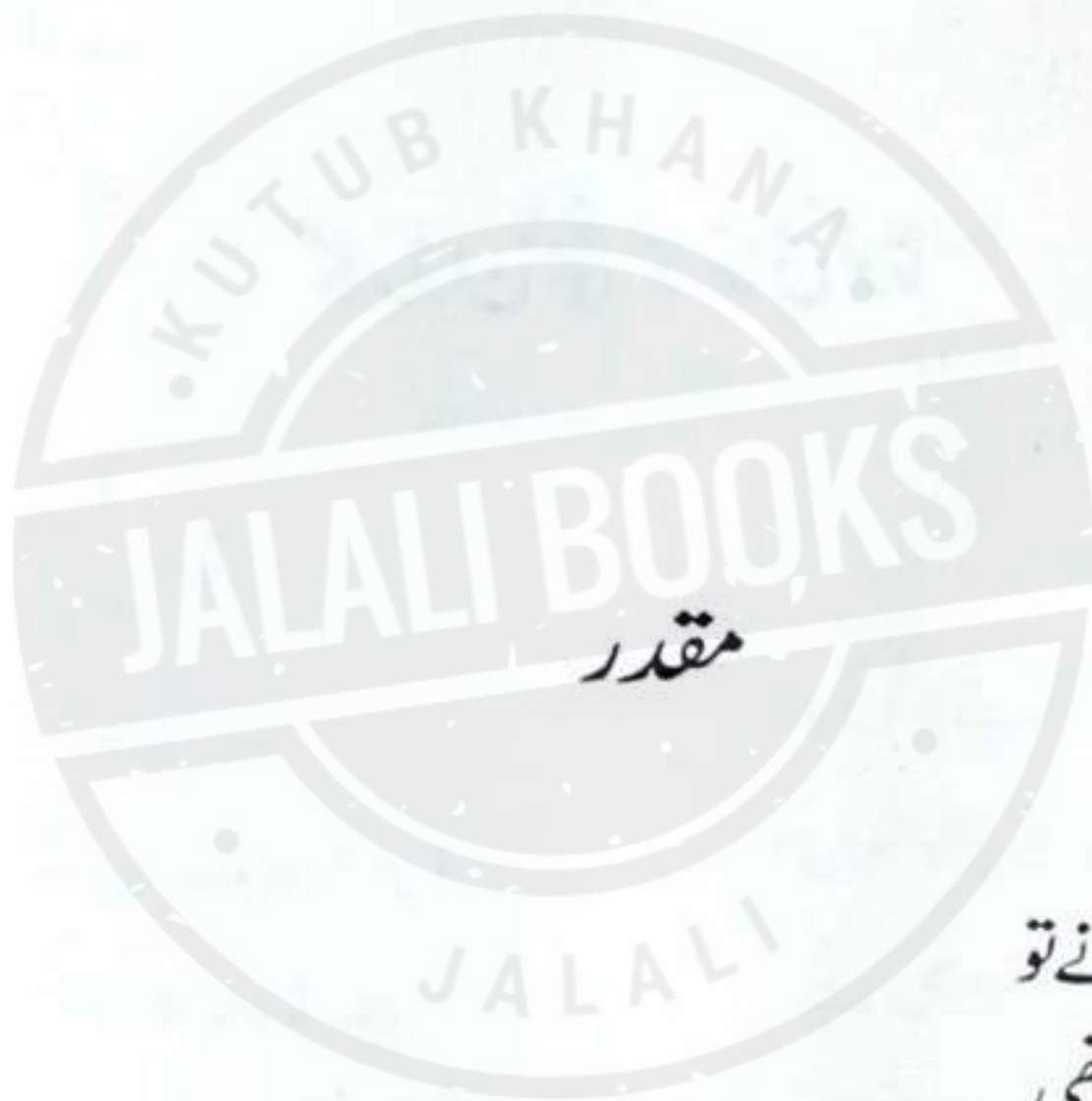
چڑیا نے تو
سوچی تھی
اک اونچی پرواز
لیکن ظالم باز

# گارڈن بینچ کا خالی کونا

نہیں ہو تم

مگر یہ حسن

جس سے میرا ویرانہ

سنورتا جا رہا ہے......

......پرانے بینچ کے کونے میں

پتوں کا سنہری ڈھیر

بنتا جا رہا ہے

# شاخِ نشاط
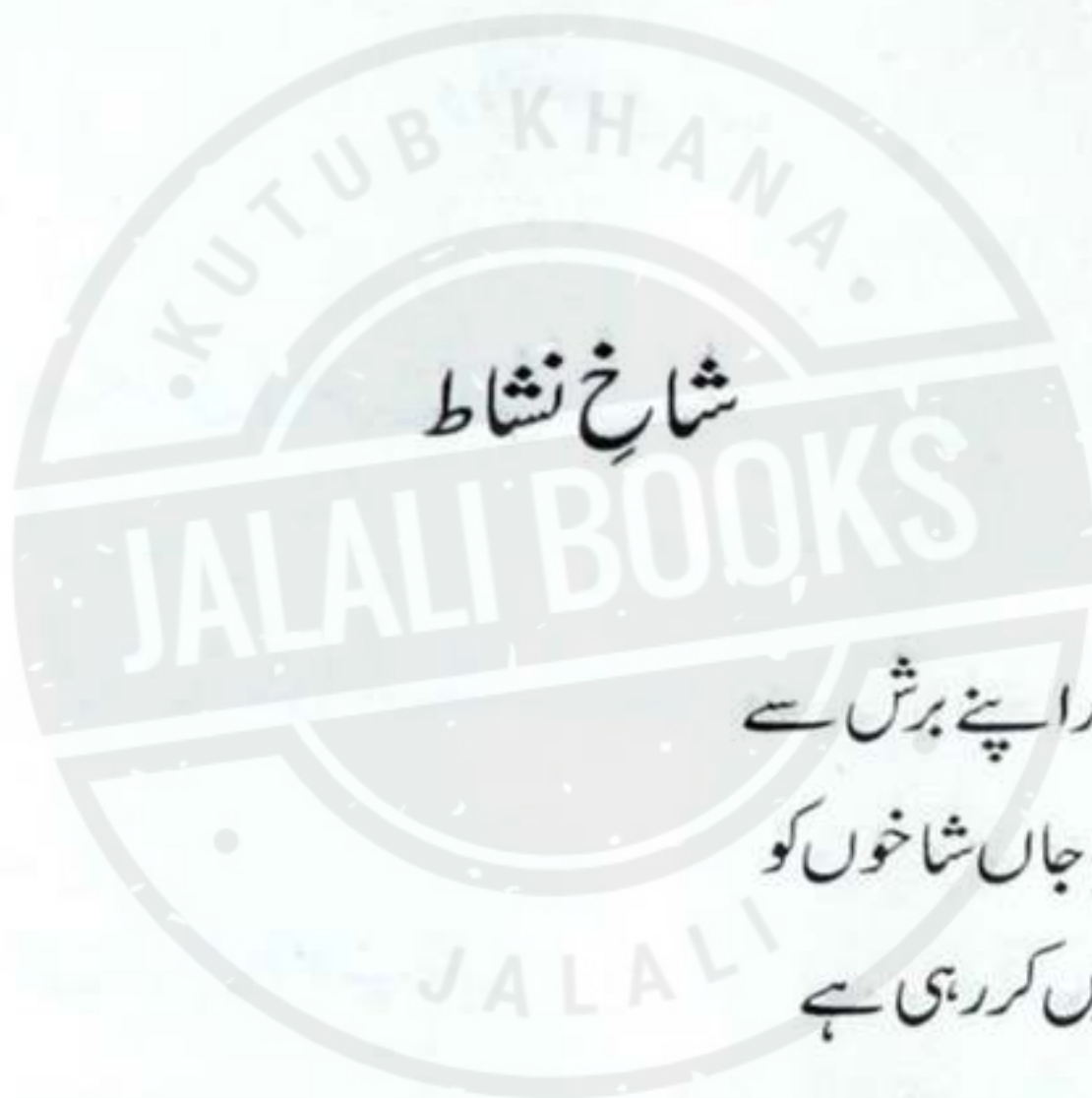
بہار اپنے برش سے
نیم جاں شاخوں کو
رنگیں کر رہی ہے
ترے سوئے ہوئے بازو پہ
تتلی (اُڑتے اُڑتے)
رُک گئی ہے

# دو تصویریں

وہ چھتری کی طرح کھل کر
ملی ہے
گلی میں آج بارش پھر رہی ہے

میں اس کی دھوپ میں
بیٹھا ہوا ہوں
یہ اس کے ساتھ
پہلی جنوری ہے

## آخری بات
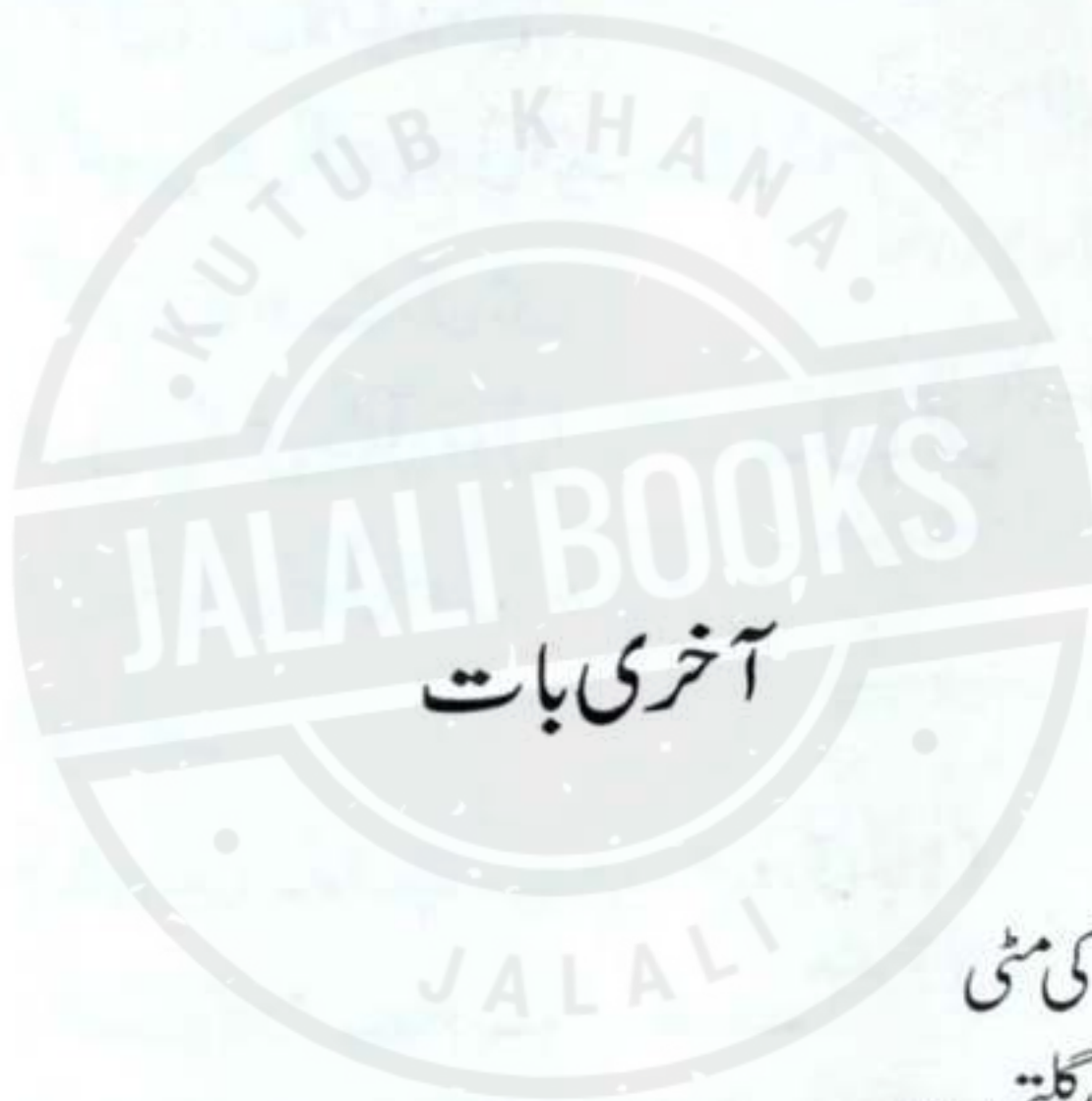
دنیا کی مٹی
سونا اگلتی ہے
اور مٹی کا سونا
موت کا زیور بنتا ہے

# زندگی

انتظار کے بوجھ سے جھکا ہوا
غصیلی بارش کا ایک دن
آنکھوں میں چھپی ہوئی ایک برفیلی شام
ٹھٹھرتے ہوئے دل میں
محبت کی گرمی جتاتی ہوئی ایک عورت کی باتیں
لمحہ لمحہ قربان ہوتی ہوئی زندگی کا
ایک حصہ
(جسے میں نے اپنے لیے بچانا ضروری جانا)
والد کے چھوڑے ہوئے ترکے سے
شرافت کی ڈھال اور احتیاط کی تلوار اٹھا کر
میں اس میدان میں آ گیا ہوں
جہاں موت کے ساتھ آخری معرکے میں
مجھے شکست ہونے والی ہے

# چکر

ہوا نے گلابی تتلی کو
خاکستری پروں والے پروانے کا
جو پیغام پڑھ کر سنایا
وہ کچھ یوں تھا:
سب کچھ شمع جلتے ہی خوب صورت ہو جاتا ہے
آہستہ آہستہ یہ خوب صورتی اتنی پھیل جاتی ہے
کہ اس کے نیچے
بدصورتی کو آسانی سے جفتی کرنے کا
موقع مل جاتا ہے
اور وہ ایک سے دو اور دو سے چار ہونے لگتی ہے
حتیٰ کہ ایک اور شمع
اپنے سر پر آگ جلانے کے لیے
تیار ہو جاتی ہے

## مشورہ
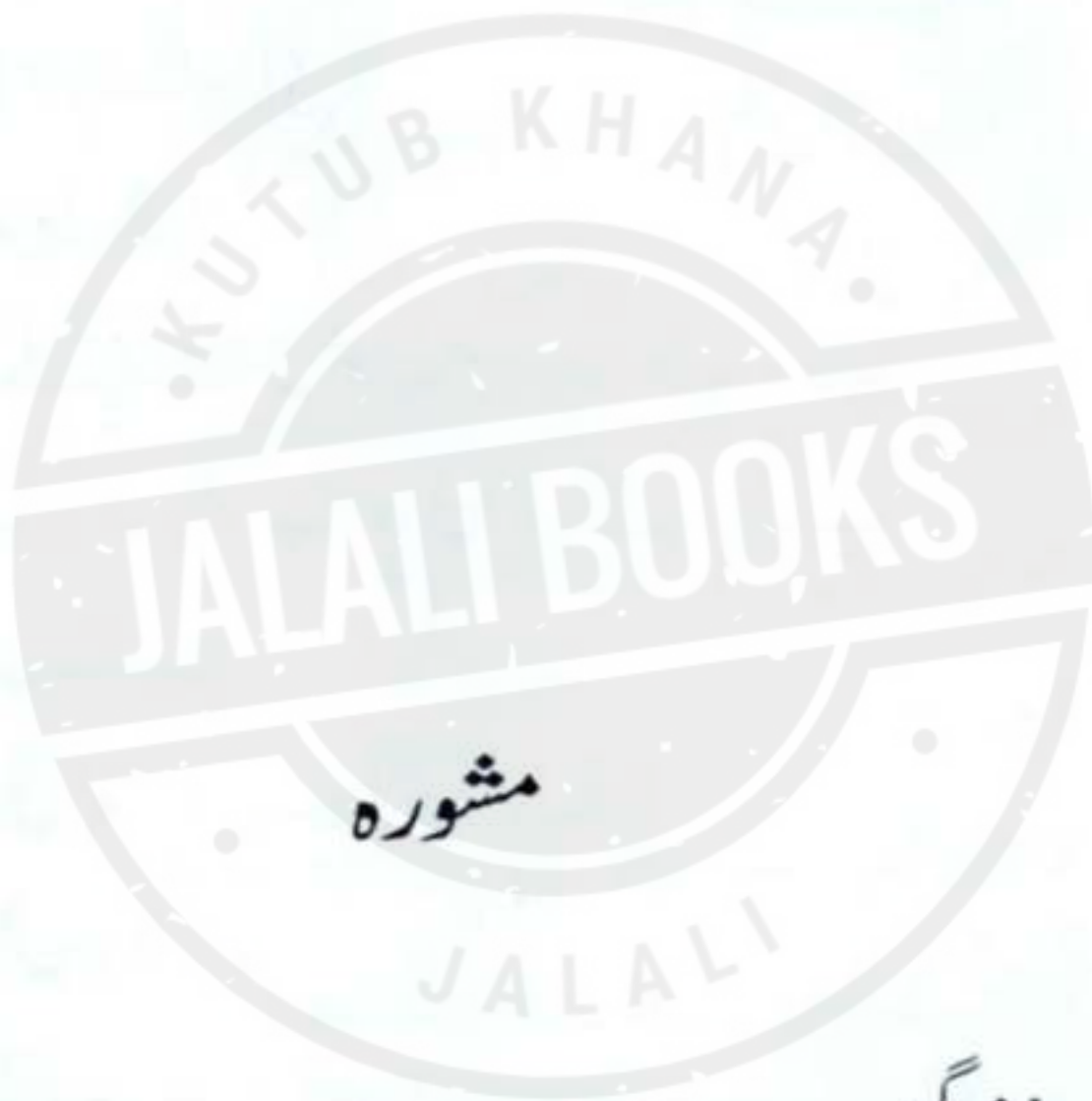
زندگی
ڈرامے سے نہیں بنتی
ڈراما زندگی سے بنتا ہے

## بادلوں کا کھیل

پھر چاند چھپ جاتا
اور تم نکل آتے

بادلوں کا کھیل بھی عجیب ہوتا تھا
ہم چلاتے ہوئے کہتے......'بحری جہاز'
مگر اگلے ہی لمحے میں وہ شتر مرغ بن جاتا
صحرا شام کو رخصت کر کے اداس ہو جاتا

اور چاندنی کی باریک تہِ برش سے ٹپکنے لگتی
اچانک فرش کی چاندنی پر
مسکراتے ہوئے تم نکل آتے

رات موتیے کے پھولوں سے آہستہ گزرتی
اور کسی کو جاتے ہوئے ہم دیکھتے
کانوں میں خوش بودار چھوٹی چھوٹی کلیاں
بالوں میں جگ مگ کرتے جگنو تارے
اور آنکھوں میں خواب
ہلکی ہلکی بارش
دل کے اندر
یادوں کی بے شمار ننھی ننھی چھتریاں اگنے لگتیں
اچانک اک دروازہ کھلتا
اور تم نکل آتے

بادلوں کا کھیل بھی عجیب ہوتا تھا

# چوبِ خشک

رات کی خنکی میں ترے آنسو کتنے گرم ہیں
یہ بے کار کی مایوسی کس کام کی
دیکھ! ہرا بھرا جنگل تری تاریخ ہے
جو تیری رنگ بہ رنگ داستانوں سے بھری ہوئی ہے
چھاؤں بھرا درخت تیرا ماضی ہے
اور اس پر۔۔۔۔ چڑیوں کے وہ گھونسلے۔۔۔۔اور گیت
یہ سب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا، لیکن پھر بھی آسمانی یاد میں محفوظ ہے
بعض حشرات اور خطرات تیری موت کا سبب بن سکتے تھے

مگر فنا اور بقا کی یہ جنگ تو نے اب تک نہیں ہاری
مستقبل ترے بدن میں چھپ کر بیٹھا ہے
کشتی، کرسی، میزیں، الماریاں، اور آرام دہ پلنگ
مرد، بچے، عورتیں اور نئی محبت سے مہکتے پریمی جوڑے

لیکن کیا اچھا ہو اگر ایک بانسری بھی تجھ میں کہیں پڑی ہو
اور وہ سُر جو ابھی ظہور میں نہیں آئے

لیکن میں نے
تیرے اندر اک تابوت چھپا دیکھا ہے
جس پر دیمک کی ایک لکیر
ٹھہر ٹھہر کر کچھ سوچتی جاتی ہے
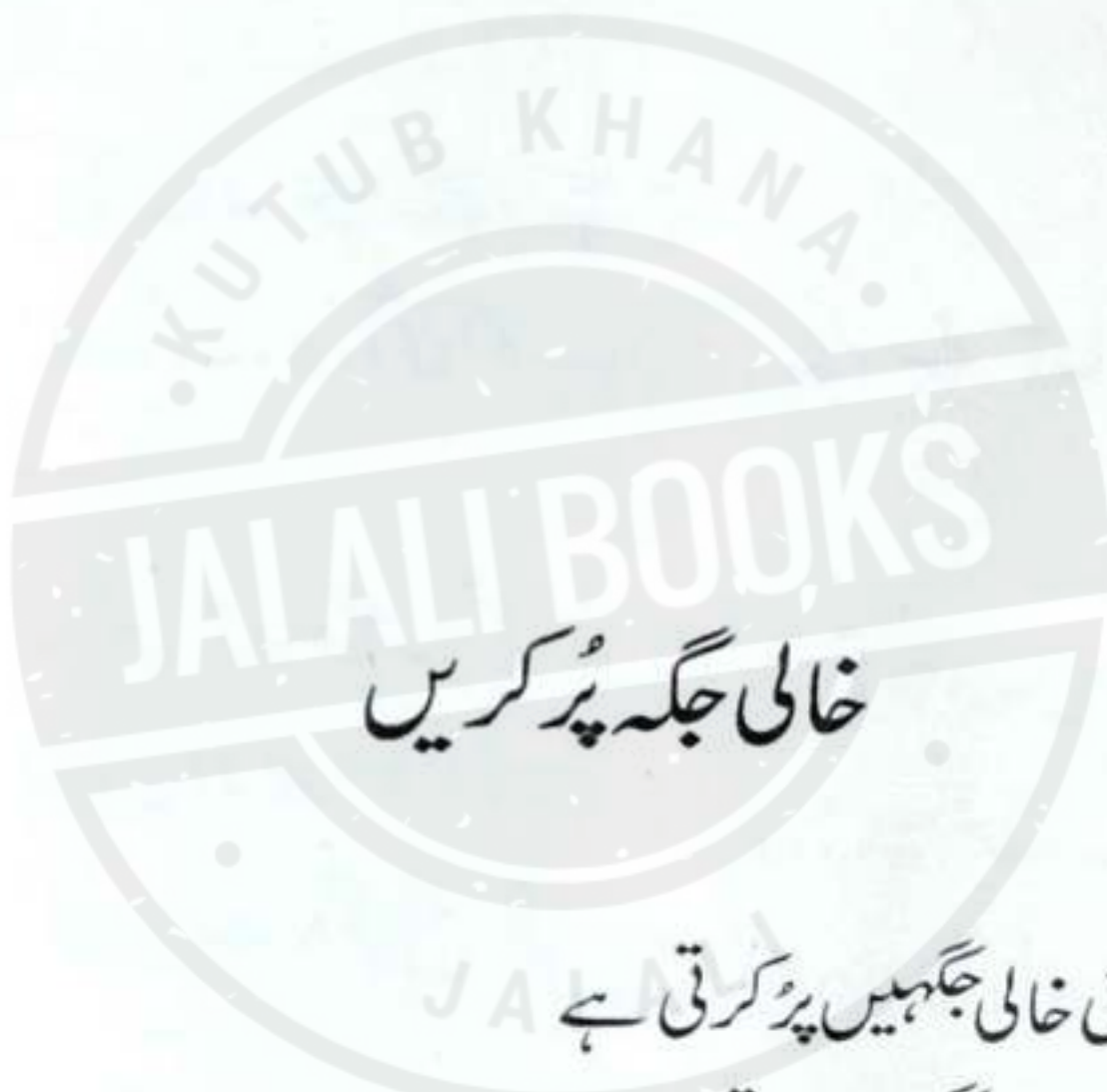
## خالی جگہ پُر کریں

روشنی خالی جگہیں پُر کرتی ہے
لیکن خالی جگہیں ہوتی ہی کہاں ہیں
وہاں تو اندھیرا گھسا ہوتا ہے

.............

اگر تم اندھیرے سے کالک نہیں بن سکتے

تو پھر روشنی سے چمک کیوں جاتے ہو
اس نے اپنے بالوں کو برش کرتے ہوئے پوچھا

..................

میری کریم کون لے گیا
چہرے کی چھائیاں مٹتی ہی نہیں

..................

روگ اندر ہی اگتے رہتے ہیں
اور لوگ باہر روشنی اگانے کی کوشش کرتے ہیں

روشنی کبھی باہر نہیں اگتی
جہاں اندھیرا سما سکتا ہے
وہاں سے روشنی جنم لیتی ہے
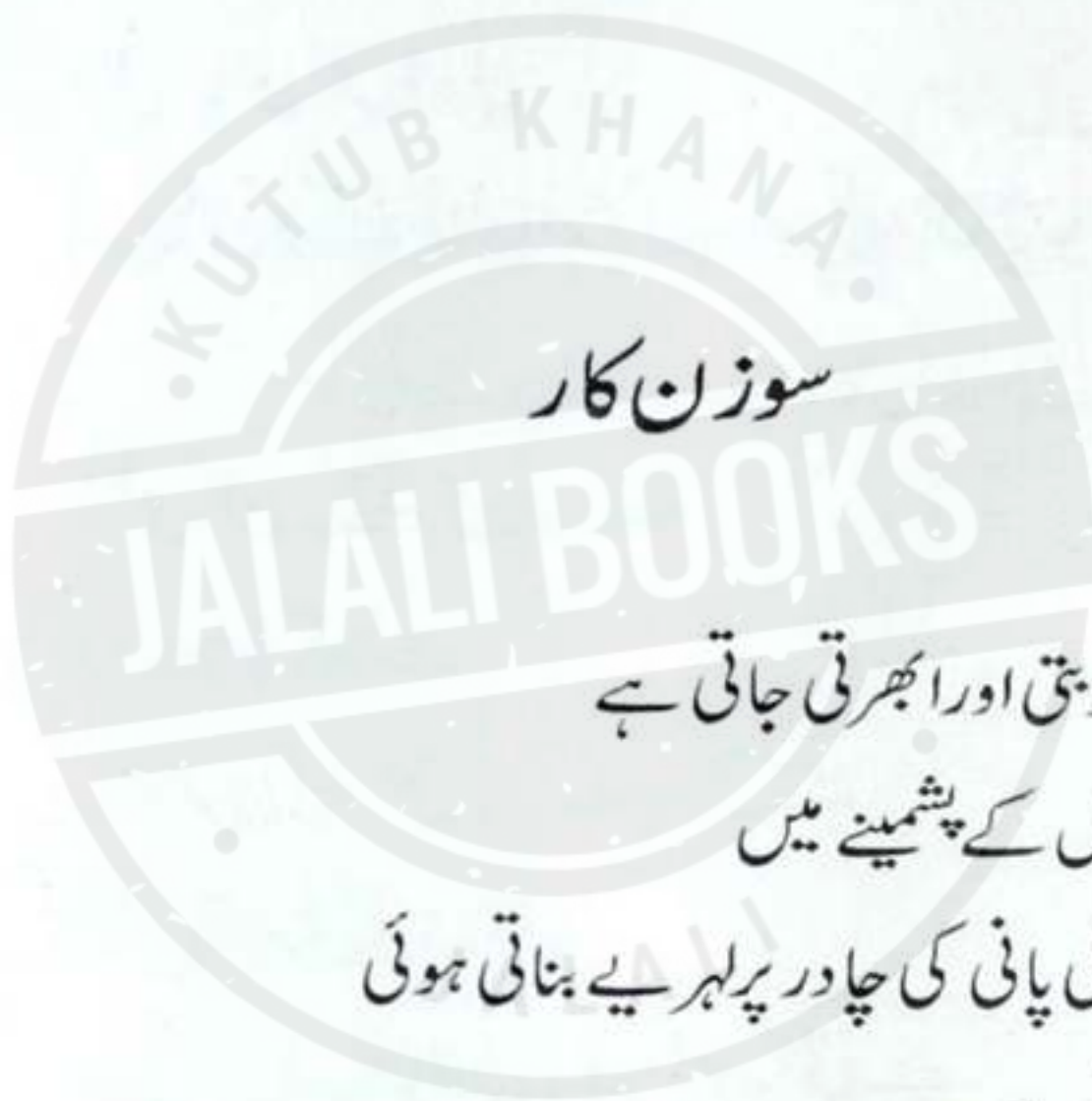
## سوزن کار

سُوئی ڈوبتی اور ابھرتی جاتی ہے
نیلی شال کے پشمینے میں
جیسے مچھلی پانی کی چادر پر لہریے بناتی ہوئی
گزرتی ہے

سفید پتلی انگلیاں
لال گلابی پوریں جن کی

برسوں کی زخمائی ہوئی

اپنی ہنرمندی کے بوجھ سے ہلکان

لیکن پھر بھی کیسے تسلسل سے چلتی ہیں

کم نظری کا رونا روتی آنکھیں

اپنی سیاہی میں ڈوبی

اپنے فن کو کتنے تفاخر اور خوشی سے دیکھ رہی ہیں

مشکی تِل نے قمری چہرے کا

رخسار سجا رکھا ہے

کم عمری کی رونق چہرے پر دمکتی ہے

لیکن مجبوری کی زردی

دھاگوں اور خیالوں سے الجھی رہتی ہے

زانو پہ دھری کشمیری شال پہ

سوزنی کا کام جاری ہے

آری، بجنی کے انداز چمکتے رنگوں میں ڈھلتے ہیں

طِلّے بار سے پھول اور پتے ہنستے ہیں
زعفرانی زندگی لمبے چھوٹے
ٹانکوں سے بھری ہوئی ہے

آج کا دن مصروف تھا لیکن
خزاں کی شام
صحن میں آ کر چپکے سے اک بات کہہ گئی ہے
نہ جانے سوزن کار کی رات کیسے کٹے گی

## یاد

کسی برباد علاقے سے
نکلی
ایک گلی ہے
جس میں ہر شے
اپنی موت کے بعد آتی ہے

# جہاں زیب کی دوسری شادی

'کہاں زیب دیتا ہے اس کو
جواں بیٹیاں کیا کہیں گی
کم از کم
بہشتن کی روح پہ ہی احسان کر دے
اکتیس برسوں کی گہری رفاقت....
کئی سال تو دونوں
اولاد کی آرزو میں
سلگتے رہے
سچ تو یہ ہے کہ
اب اس کی حاجت ہی کیا ہے

(قیامت...

مرے شہر سے ہو کے گزری ہے باجی!

مگر لوگ

پہلے سے بڑھ کر ہیں دنیا کے طالب)'

پڑوسن نے

تخمِ نباتات کی طرح طعنے بکھیرے

اور اوپر سے

نینوں کی چھم چھم نے

ایسا زرِ نم ملایا

کہ جس سے یہ زرخیز مٹی

اگلتی ہے سونا

مگر سونا کب ان کی قسمت میں ہے

جو شکن در شکن

اپنے بستر میں برسوں کی جاگی ہوئی ہیں

## وہ دونوں

الگ اپنے بستر کی تنہائیوں میں پڑی
سوچتی رہ گئیں
کوستی رہ گئیں
انھیں تیسری کا
یا چوتھی کا غم تھا
نہ اس بے وفائی کے پُتلے جہاں زیب کا

دونوں بستر کی ٹھنڈک کی ماری ہوئی
رات میں جل رہی تھیں

# بغداد

مگر.....

منصور!

ایسا بور ہے جیون درختوں کا

جو ہر غارت گری کے سرخ موسم میں

سرِ شاخِ نخیلِ جاں

اکیلا ہی نکلتا ہے

سو تم اس ایک ورثے پر

ثمر کاری کا سارا فن

حیاتِ عالمِ فانی کی ساری نعمتیں قربان کرتے ہو

ہزاروں بار اُجڑتے ہو

## Minutes of the meeting

قینچی چپل ہی پہن کر
چل رہی ہیں آج بھی
پوچھتی ہیں
'وہ... ہمارے خواب کس لاکر میں ہیں'
اور.... کیا ہم دیکھ سکتے ہیں انھیں'
منھ سے استفسار کی عادت نہیں
اس لیے آنکھیں سوالی ہیں یہاں

ہم سے کیسا پوچھنا... اپنے خدا سے پوچھ لیں

بینک نے تو لاکھ کوشش کی مگر
ان کی نظر آفاق پر جاتی نہیں
پاؤں کے آگے بچھے رستے سے اٹھتی ہی نہیں
قسمت کہاں چمکائے
جو پیسا بھی آئے
اس جہنم ہی میں جائے
اس سے پہلے کہ نمو پر آئے
ان کے تخم بھی
سڑکوں پہ آئیں
ان کے پاؤں ہی اُڑا دو
یا کوئی ایسا عجب جوتا بنا دو
جو اڑا لے جائے ان کو
اور ان کے خواب کو
آسمانوں.... ماورائی داستانوں کی طرف
.... یا.... طالبانوں کی طرف؟

# سمندر جا رہا ہے

رکھ دیا سامان کشتی میں
کہا اس سے
اجازت دو
سمندر جا رہا ہے
میں بھی جاؤں ورنہ تنہا مارا جاؤں گا یہاں

وہ ندی تھی
اور بل کھانے، ادا دکھلانے
اور جذبات میں بہنے، بہانے کے
طریقے اس کو آتے تھے
پہاڑی کی اٹھی کوہان جیسے
اپنے سینے کے ابھاروں پر

ہتھیلی پھیر کر کہنے لگی

سُن ... کیسے جا سکتا ہے تُو ...!

میرے سینے پر ترے جذبات کا لاوا

مسلسل بہ رہا ہے

اور تو پاگل ابھی سے کہ رہا ہے

میں بھی جاؤں

جانتا بھی ہے سفر کو بے خبر

.... یہ تو خیر اک بات ہے

ہونا جدا

لیکن مجھے یہ تو بتا

آخر کہاں جائے گا تُو

'اُس' سمندر کی طرف

پگلے

تو میں بھی جا رہی ہوں

# مہندی اور لکیریں

پھول بیلیں
ہاتھ پر مہندی سے کاڑھیں
ہار نوٹوں کے پروئیں من چلی پریاں خوشی سے
ویر جن کے کام سے واپس نہیں آئے ابھی
کھیل کھیلیں زندگی کے
اک پری کا ہاتھ دے کر
ہاتھ میں اک آدمی کے

سج رہی ہیں ناریاں

بج رہا ہے جاز.....

.....آ گئی بارات

لے جائیں گے ساتھ

اونچی جن کی ذات

کوئی شے بازار میں جیسے بکے

اس طرح عورت بکی

سنگ دل تاریخ میں

بکتی رہی یہ نازکی

شہزادیاں، پریاں، مروت زادیاں

طرزِ غلامانہ، رسومِ عاجزانہ پر کریں کیا بات

حکم ہے اس کا

یہاں ہر بات کا حق ہے جسے

ہاں مگر جو ہاتھ پر لکھتا رہا
نسلوں پرانی داستاں
اس کا نشاں
دل میں ابھی چمکا کہاں

ہاتھ رنگیں ہو گئے
لیکن لکیریں
جب نکلتی ہیں ابھاروں کی طرف
زنجیر زن ہو کر بتاتی ہیں ہمیں
رائگاں
سب رائگاں

## پرانے دوست

دل رُبا پتوں سے پریاں
اور ہاتھوں سے ہوائیں کھیلتی ہیں
پاؤں ننھی طشتری میں رکھے
اُڑتے جا رہے ہو
اک ہرے جنگل کے خوابوں سے پرے
پریاں تمھارے ساتھ تصویریں بناتی
گیلری دل کی سجاتی ہیں
کوئی صدیوں کا نغمہ گنگناتی ہے ہوا
تم نے سنا

اور ہنس دیے

دل میں لیے ان جنگلوں کی یاد

جن میں

تم ہزاروں جُگ جیے

پیڑوں کی پیڑھی

پڑھتے پڑھتے

رک گئی ننھی پری

خاک پر رکھ دی کتاب

اے خدائے بوتراب !

کیا کرے علمِ نبات

من میں جب خودرو

شجیرے کِھل گئے

کیسے کیسے گھاؤ دل کے سِل گئے

آج تم کو دیکھنے اس پارک میں

دوست برسوں کے پرانے مل گئے

دھوپ میں ہنستے صنوبر!
آج تیری رونمائی نے
دکھائی ہے خدائی
یہ بتا کتنے زمانوں نے بنائی.... یا گھٹائی
زندگی کی بونسائی

# ایک بوڑھی عورت کا جنم دن

اک ٹھٹھرتی صبح ہے
ڈاک خانے کی گلی میں
زرد پتے اُڑ رہے ہیں
کپکپاتی انگلیوں سے لکھا ایڈریس
ہر کوئی پڑھ لیتا ہے

دوپہر کے باغ میں
داؤدی پھولوں اور اس کے درمیاں
نوجوانی کے دنوں کی ایک یاد
دیر تک ہنستی رہی

سہ پہر ہے اور وہ
کونے والی شاپ سے
اک غبارہ لے رہی ہے....
لفظ ہونٹوں سے اُڑانیں بھر رہے ہیں

شام کی خاموش رہ پر
وہ کوئی اسرار پہنے چل رہی ہے
رجنی گندھا کی مہک بکھری ہوئی ہے
دور پیڑوں میں چھپی درگاہ تک

# آزادی خان

وہ ساری عمر کا تنہا مسافر تھا
دِلوں میں گھر بناتا تھا
ملال و ہجر کی ویران راتوں میں
کہانی بن کے آتا تھا
ہمارے بابا کہتے ہیں
کہ دل کا بادشا تھا اور
پسندیدہ نظر کا آدمی تھا
(آسمانی روح کا پرتو)
بہ ظاہر اس کے چہرے پر

طمانیت برستی تھی

مگر اندر

اک ایسی آگ جلتی تھی

کہ ہردم مضطرب رہتا

کسی پل سکھ سکوں دل میں نہیں تھا

وہ اکثر بے خیالی میں کہا کرتا

''یرا!!!...... یہ زندگانی...... اپنے قابل ہی نہیں تھا''

یہ اس آزاد قریے کی کہانی ہے

جہاں دنیا کمانے کا

بڑا مربوط کلچر بن رہا تھا

سیاست جادوگرنی تھی

کہ جس کے ہر اشارے پر

گھنے جنگل میں دفتر اُگ رہے تھے

یہی دن تھے

جب اس

شہر ظفر آباد کی گلیوں میں
اس کا نام گونجا تھا
وہ بہتے پانیوں کی روح
اک دن سامنے آیا
تو لوگ اس کی زیارت کے لیے
ترسے ہوئے نکلے

سیاست داں، مجاہد، مولوی
سارے اسے اپنا جتاتے تھے
ریاست کے علم داروں
صحافت کے قلم کاروں
امیروں اور سرداروں کی
شوکت، شان، عزت، آن
اَزادی خان کے دم سے چمکتی تھی
ہمارے بابا کہتے ہیں
سیاست سب سے اچھا کھیل تھا

اس وقت اس میدان میں

یوں تو

سبھی نامی گرامی تھے

مگر ان میں

غلام آزاد کشمیری

بڑا پختہ کھلاڑی تھا

عجب انداز تھے اس کے

کبھی مذہب کی کشتی پر نکلتا

کبھی وہ فقر کی میلی چٹائی پر

نظر آتا

کبھی افکار کے گھوڑے کی کاٹھی پر

کبھی غصے کی لاٹھی پر

حقیقت میں

وہ دنیادار

لمحہ ساز بندہ تھا

وہ آزادی کے ہر قصے کہانی میں

وہی بندوق لے کر آ نکلتا تھا
کہ جو برسوں پرانی تھی
غلام آزاد کشمیری کہانی تھی

مخالف سب طریقے
آزما لیتے
مگر ہر بار
وہ عیّار
ایسی چال چلتا تھا
کہ سب کو مات دے دیتا
اگر دیکھے کہ لوگوں کی نظر پھرنے لگی ہے
تو اک دم سے
اَزادی خان کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیتا
''غلام آزاد!'' ........''زندہ باد!!!'' کی آواز
کانوں میں اتر جاتی
تو خستہ تن میں

جیسے جان پڑ جاتی

غرض اس کا
آزادی خان سے ایسا تعلق تھا
کہ وہ اس کو
ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا
عوامی ریلیوں جلسے جلوسوں میں
اسی کی بات کرتا تھا
اسے معلوم تھا جب تک
آزادی خان زندہ ہے
شکست اس کے مقدر میں نہیں ہے

ہمارے بابا کہتے ہیں
پہاڑی شہر کی گلیوں میں اس دن
تیز بارش تھی
خزاں کی برف نے چادر بنالی تھی

اور اس چادر کے نیچے
زندگی کا غم سلگتا تھا
اسی عالم میں وہ نادان
دنیا کے نئے نقشے سے نکلا تھا
اور اب اپنے
مہکتے خون میں لت پت
پڑا تھا
وہ ظالم یار
جو دنیا میں
اس کے نام پر دولت کماتے تھے
اب اس کی قبر پر
ادنیٰ مجاور بننے آئے تھے
مگر وہ کب
کسی پکے ٹھکانے پر رہا ہے
وہ عمروں کا اکیلا تو
دلوں میں گھر بناتا تھا

سنا ہے

صدیوں پہلے بھی

اسے لوگوں نے شالا مار سے آتی

ہوا کے ساتھ دیکھا تھا

وہ حضرت بل کے گنبد پر چمکتا

ڈل کے نیلے پانیوں پر سوئے

پھولوں میں دمکتا تھا

پہاڑ اپنے خزانوں میں

اسے محفوظ رکھتے تھے

زمیں کی خاک

اس کے رنگ سے گل زار ہوتی تھی

وہ بچوں کے گلابی نرم چہروں سے جھلکتا تھا

ہمارے بابا کہتے ہیں

آزادی خان

ایسا نام ہے، جس پر
خدائی ناز کرتی ہے
زمانے جس کی وسعت میں
ہزاروں رنگ بھرتے ہیں
اسی کی آرزو میں لوگ
جیتے اور مرتے ہیں
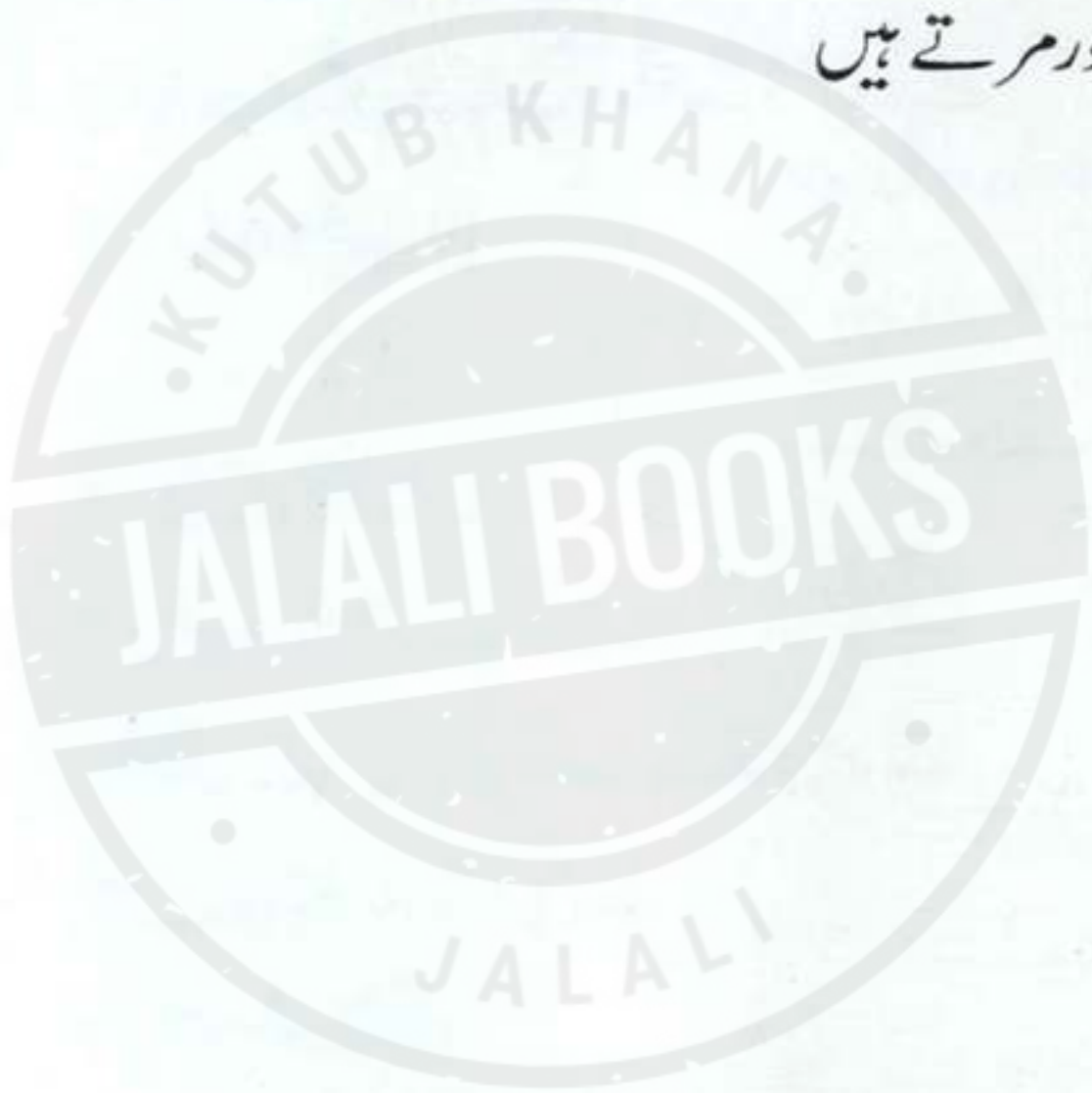
# قصہ خوانی

سن کے بھی چپ ہی رہا
تلخ باتیں، مشک بار افغانی قہوے کے
رسیلے گھونٹ میں گھل مل گئیں
یہ حقیقت اور تھی کہ باپ دادا قصہ گو مشہور تھے
اس لیے وہ چپ رہا

تاریخ کے نقشے میں
جن شہروں کی شہرت گونجتی ہے
وہ خموشی کے اس ازلی رنگ سے ظاہر ہوئے
جس سے شناسائی نہیں ہے
اس ہجوم شور و شر کی

اس نے سوچا
یادگاری چوک میں چاروں طرف
یہ بولتے بازار ہیں

اس لیے افسردگی میں گم کھڑے
اس بید مجنوں پر
نظر پڑتی نہیں
جو اکیلا رہ گیا ہے قصہ خوانوں میں یہاں
بے رنگ اکھڑتی چھال پر
چاقو سے کندہ نام پھیکا پڑ گیا ہے
کندہ کاری جا ملی ہے خاک سے
وقت کی غفلت نے کیا ثابت کیا
زخم کھانے اور لگانے والوں میں
کون فتح یاب ہیں

شیریں گل!
آگے سُنا
کیا سبز آنکھوں میں بھی خاکی خواب ہیں

# ابھی کھیلو

ابھی کھیلو

کہ اس مخمل پہ نازک انگلیاں تھکتی نہیں ہیں

یہ مٹی کی ہتھیلی ہے

یہاں پر نرم تلوے خواب چپکائے ہوئے چپکے سے آتے ہیں

اسی مخمل پہ چلتے ہیں، پھسلتے ہیں

مگر تم تو

کہیں آتے نہ جاتے ہو

تمھیں کیا ہے تماشے سے

تماشا بین بھی ہم ہیں

تماشا بھی

ابھی کھیلو

کہ ہم پر نیند طاری ہے

ہماری نرم ریشم سی ایالوں سے ابھی کھیلو

ہماری برق آنکھیں کس نے دیکھی ہیں

لچکتی رات میں سوراخ کرتی دھاڑ کن کانوں میں اتری ہے

ہوا رفتار پنجوں سے

بدن گل نار ہوتے کس نے دیکھے ہیں

ابھی کھیلو

ملائم سرخ مٹی سے

بناؤ شیر گھوڑے اور تلواریں

ہوا میں تیر پھینکو اور پانی میں

اتارو کشتیاں کاغذ کی

فوجیں ہیں ابھی دشمن کے دل میں

تم ابھی سے پڑ گئے ہو کیسی مشکل میں

ابھی کھیلو

تمھیں کس نے کہا سرکس لپیٹا جاچکا ہے

موت کے کنویں میں لچکیلی کمر والی

وہ دوشیزہ تو اب بھی ہے

جو قومی ٹیکس کا ٹھپا

بھڑکتے سرخ ہونٹوں سے لگاتی ہے

اور اپنی آستیں

سرکس کے شیروں کی ایالوں سے بناتی ہے

جو بالوں میں سیاہ کالے دنوں کی راکھ بھرتی ہے

سمجھتی ہے

ابھی دھرتی کے ریشم کو

گلے کا پھندا بننے میں کئی دن ہیں

# سنبھل کر چل

سنبھل کر چل
بہت گہرا اندھیرا ہے
تمھیں غاروں میں ایسا غار کم ہی مل سکے گا
یہاں دھرتی نہیں کچھ آسماں سا ہے
درخت اس نیلی چھت کے ساتھ یوں چپکے ہیں
جیسے یہ اسی امبر کا حصہ ہوں
کئی دن سے یہ سب نیلے درخت اس آسماں سے اگ رہے ہیں
ابھی میں تم سے کیا کہنے لگا تھا
سنبھل کر

ہاں مجھے کہنا تھا

کہ اس غار سے نکلیں تو شاید آسماں سے ہم زمیں دیکھیں

مگر ہم تو زمیں پر تھے

یہ کیسے آسماں پر آ گئے ہیں

خلا تو اس زمیں پر بھی بہت ہے

مگر ہم آسماں اس کو نہیں کہتے

زمیں تو آسماں پر بھی بہت ہے

مگر ہم اس کو دھرتی کیسے کہہ دیں

چلو اس غار سے ہو کر نکلتے ہیں کسی جانب

سنبھل کر

ہاں سنبھل کر چل

یہاں پر روشنی اتنی زیادہ ہے

کہ آنکھوں میں اندھیرا ابھر گیا ہے

# سری نگر روڈ

۱۔ جہلم کے ساتھ ساتھ

۲۔ واپسی کی خواہش

۳۔ ریشم سازوں کی بستی

۴۔ نیند کا سایہ

۵۔ نیند کے بعد

# جہلم کے ساتھ ساتھ

للّہ!

تم نے سچ ہی کہا تھا

''اپنی ہوا سے بہتر کوئی لباس نہیں''

میں نے دیس کا سارا موسم اوڑھ لیا ہے

میرے کانٹے

میرے ہی دل میں چبھتے رہتے ہیں

بڈشاہ!

تیرے ملک کی مٹی

کتنے پھول اُگا سکتی تھی

کتنے رنگ بنا سکتی تھی

جو گلزار اس خاک سے مہکے

اور آفاق میں چمکے تھے

## سب حشرات کا رزق ہوئے ہیں

حبہ خوتن!

تُو پتھر کی آنکھوں میں بھی

ریشم خواب جگا سکتی تھی

تیرے میٹھے بول

ہماری بیٹی کو کب یاد رہے

چڑیا کے پر ٹوٹ گئے تھے

شاخ پہ کیسے گا سکتی تھی

یوسف چک!

ہم قیمت بے قیمت بکتے آئے ہیں

سازش ایک تبسم کی مانند

دل میں اُتری رہتی ہے

تیرے لوگوں نے تہذیب کی جنگ لڑی تھی

(جانے کتنی بار لڑے ہیں)

لیکن جابر مغل اعظم آج بھی نیلم پار کھڑے ہیں

اے سلطان شہاب الدین!

اس جنت پر

اب تک اتنی برف گری ہے

آنکھ کو آنسو

شاخ کو اکھوے

اور چشموں کو اپنی روانی یاد نہیں

اپنا تسلسل ٹوٹ گیا

کوئی کہانی یاد نہیں

میں قرنوں کے کچے پکے

رستے چھان کے

اب ایک ایسی شاہ راہ پر آیا ہوں

جو میرے اندر سے ہو کر

گہری دھند میں گر جاتی ہے

میرا سفر

اور میرا سایہ

مجھ سے لمبا ہونے لگا ہے

سارے وقت

مری ساعت میں جاگ رہے ہیں

کائل کے جنگل میں دھوپ

اور مری تاریخ کے دن میں

کالی راتیں ڈوب رہی ہیں

اب میں سو نہ سکوں گا لیکن

سرد سڑک پر

میرے خواب سفر میں ہیں

بائیں جانب

جہلم میرے خون کی صورت

دوڑ رہا ہے

سندر ڈل کا شیتل جل

میرے شہر کا سینہ کھول کے نکلا تھا

اس کی لہریں زندہ سچی لہریں ہیں

اور گردابی ناف میں وہ کستوری جس نے

سندھ کو اور پنج آبے کو

خوش بُو خوش بُو موسم

گندم سونا، چاول چاندی

مستقبل کے رنگ دیے ہیں

لیکن میرے خواب شکارے

مایوسی کے ٹھہرے پانی میں

دھیرے دھیرے ڈوب رہے ہیں

اور ساحل پر وہ خاموشی ہے

جو تنہا ویران درختوں کی شاخوں پر ہوتی ہے

یا گونگے کی آنکھوں میں

اس کا مجھ سے کتنا پرانا رشتہ ہے

برسوں سے

میں اس کی

یہ میری جانب چلتا ہے

میں اور جہلم ایک بدن میں بہتے ہیں

(پیاس کے مارے میدانوں تک

اپنی خوش بوؤں کے ساتھ)

پاؤں بندھی

ان جانی مسافت کے خلاف

یہ ہمارا آزادِ سفر ہے

وہ چاہتے ہیں

گیت اور خوش بُو

میدانوں میں ہجرت کر کے مر جائیں

زندہ پانی

مستقبل کے ساحل تک

اپنا رستہ پھینک نہ دے

شاید میری زمیں کا پرچم

میری ہتھیلی پر کھلتا ہے

دریا پر اور خوش بُو پر
کوئی روک نہیں
ویری ناگ سے ایک کہانی چلتی ہے
گیت مسلسل بہتا ہے
خوش بُو اُڑتی رہتی ہے

سورج نصف نہار میں ہے
اور میں پوری صدی میں ڈوبے
اپنے سنگ میل میں درج
اپنی روح سے دور کھڑا ہوں
پلکوں کی شاخوں پہ مسلسل
آنسو موتی پھوٹ رہے ہیں
اور ہونٹوں کو چیر کے آنے والے
سارے جملے ٹوٹ رہے ہیں

# واپسی کی خواہش

وہ برفانی رات
بادام، اخروٹ اور ستّو
سرما کا شہد اور ساگ کی خوش بُو
اور اک لوک کہانی میں گم
آگ کے گرد
میں اور تم

آؤ چلیں
چرخے کی آواز میں ڈوبی
اس بستی میں
شام جہاں پر ایسے اُترے

جیسے کسی بیمار بدن میں

## جیون رس

برف کی رت کا پہلا دن
کتنا سفید اور آزردہ ہے
دریا اپنی مجبوری کا گدلا پانی
اور ہماری ناداری کے
آنسو اپنی پشت پہ رکھے رینگ رہا ہے
اور سڑک پر
برسوں پرانے لوگ نکل کر چلتے ہیں
ان کی آنکھیں
ایک پرانی یاد سے بوجھل
اور چہروں پر
کوئی گہرا خوف جما ہے
دھانی گھاس کے جوتوں میں یہ
اپنے جلتے پاؤں پہن کر

اور ہونٹوں پر
ہجر کے گیتوں کو سلگا کر
نئے سفر پر نکلے ہیں

آؤ چلیں
ان گلیوں کی دشواری میں
جو پنجال اور حاجی پیر کے اندر کھلتی ہیں
جن کے پار
ایک الاؤ سا جلتا ہے
جن میں چلنے والا جیسے
گہرے خواب میں چلتا ہے
آؤ چلیں
اور چل کر دیکھیں
جسم کے داغ اور روح کے سوگ
آگ جلوں نے کب دیکھے ہیں
برف میں جلتے لوگ......

......لوگ

جنھوں نے

برف رتوں کا ورثہ پال کے

کس جوکھم سے

ماہ و سال کے

اندر رہنا سیکھ لیا تھا

ان پر کیسا وقت پڑا ہے

آؤ چلیں اور

ایک سوال کی شمع جلا کر

اس برفانی رات میں اُتریں

# ریشم سازوں کی بستی

رات کے گھر سے بھاگی
دھان کی خوش بُو میں لپٹی
صبح کھڑی ہے
پربت پر آکاش جھکا ہے
یوں لگتا ہے
جیسے اس پر
ریشم کا اک نیلا تھان کھلا ہے
اس منظر کے
پس منظر میں
آگ بہت کچھ چاٹ چکی ہے
لوگ بہت کچھ بھول گئے ہیں
وہ ہم سب کا زخمی ہاتھ
اس ریشم خانے میں نہ جانے
کتنے رنگ ملا کر جس نے

اک پرچم تخلیق کیا تھا

اس نادان کو ہم سے بچھڑے

آج کئی جگ بیت گئے

اور اس کے جوہر کا خون

ایک سوال کی صورت اپنے

مستقبل میں پھیل گیا ہے

لوگ بہت کچھ بھول گئے ہیں

مستقبل کی اس تاریک خیالی میں بھی

میرے لیے

وہ خواب بہت ہے

جس میں ہم نے

بیس سنہری دن دیکھے تھے

اور وہ بات

جسے ہم صرف

دردستان کی خاموشی میں سُن سکتے ہیں

وہ گونج ابھی کانوں میں ہے

وہ خواب ابھی آنکھوں میں ہے
وہ......ریشم بننے والوں کی بستی
اور وہ لوگ
ان کے ہاتھوں کے فن پارے
ٹھنڈی راکھ میں
سرخ انگارے
اکتوبر کی شام کے تارے
اور وہ بیس سنہری دن
ہم کو ہمیشہ یاد رہے
ان کی چمک سے
دل اب تک تابندہ ہے
ہم میں، تم میں
آزادی کی آگ
ابھی تک زندہ ہے

## نیند کا سایہ

شام کے آتش دان کے اندر
ایک پرانے رنج سے لتھڑے
دن بُجھتے تھے
اپنے پیالے
روز اپنے ہی
تازہ خون سے بھر جاتے تھے
پھر اس رات کی حبشی عورت
ہنس کر جیسے
ایک کرن سی چھوڑ گئی تھی

یہ ساعت جب

سُکھ کا سانس لیے اُتری تو

جانے کیوں دل ڈوب گیا تھا

ہم تو اپنے ہی لوگوں سے بچھڑے تھے

اور یہاں پر

سبز سنہری خوابوں کے

خیام بسانے آئے تھے

لیکن اپنے رہن سہن میں

پھر سے چیزیں ٹوٹ گئیں

کتنے سال

ان خوابوں کی تقویم سے باہر

بیت گئے

اپنی حیات اصحاب کہف کی رات ہوئی

آخر نیند اُتار کے کس بازار چلیں

اپنا سکّہ بدلے زمانہ بیت گیا

(شہر میں کس کا حکم ہے جاری)

بے خبری کا جالا چھت پر پھیل گیا

غار کے منہ پر

بھاری پتھر بیٹھ گیا

جس کے پیچھے

ہم سب لوگ

موت پہن کر سوتے ہیں

اور ہمارے گردونواح میں

ہر اک چیز پہ

گہری نیند کا قبضہ ہے

دُکھ سے پاگل

پھرتی ہوا پر

ہریاول کے میدانوں پر

اور جنگل پر

اور جنگل سے نیچے پھسلتی

ڈھلوانوں پر

ہر شے نیند کے پہرے میں ہے

پیڑ اور پتے

برف اور بادل

جھیل اور پانی

آنکھ اور آنسو

صحن اور کمرہ

اور کمرے میں

میز کے اوپر سجی کتابیں

لکھے ہوئے اور خالی کاغذ

اُن میں کہیں

بے تاب قلم کی سسکاری پر

سب چیزوں پر

نیند کا سایہ

جم سا گیا ہے......

لوگ بھرے بازاروں میں

اپنے نفع کی

اور نقصان کی باتیں کرتے ہیں

سوئے ہوئے ہیں

(باتیں شاید

مرگ اور زیست میں

فرق کو قائم کرتی ہیں)

چاروں جانب

نینداور برف کی نگرانی ہے

اور پرندہ صبح کا

اپنے نرم سریلے گیت سمیت

گاڑھی دھند میں ڈوب گیا ہے

برف اور نیند میں لپٹے ہوئے

اس گہرے سناٹے میں

ایک آواز

(جیسے چیونٹی کی سرگوشی

جس کو کوئی سلیماں ہی سن سکتا ہے)

اپنی نوک چبھو جاتی ہے

"آؤ بڑھیں

شہرِ سماعت کو اپنی
آوازوں سے آباد کریں
آج کی سسکاری پر اپنے کان دھریں
بعد کے گیت بھی اپنے ہوں گے''

## نیند کے بعد

شاخ کے اندر
پھیلی ہوئی تاریکی
اور اک سبز حقیقت میں
چھپی ہوئی کونپل
ہر دم جاگتی رہتی ہے
آج اس کی بیداری نے
اپنی خموشی کے معنی دریافت کیے ہیں
ایک نکیلی سی آواز پہ
سارا جنگل بول اُٹھا ہے
کوئی ستارہ

اپنی خنک اونچائی پر
خاموشی سے جاگ پڑا ہے
آج اسی کی زندہ لو سے
اپنے چراغ اور دل روشن ہیں
نیند کا جادو ٹوٹ رہا ہے

جسم و جاں کے شہر کے اندر
آگ اور خون کا موسم ہے
پھولوں اور چراغوں سے
بے گانی قبریں
آنگن آنگن پھیل گئی ہیں
خون کی سُرخی
شام کے بالوں سے بہتی ہے
کیسر پھولوں کے تختوں تک آ پہنچی ہے

غارت گر ہاتھوں کے خلاف

صدیوں کی آغوش میں بہتے
دریا آج گواہی دیں
اب کشمیر کے جہلم میں
اور بغداد کے دجلہ میں کچھ فرق نہیں

آج انوکھی بے داری ہے
پہلی کرن سے بڑھ کر اجلے
اور شفاف آغاز کے نغمے
کانوں میں رس گھول رہے ہیں
اے گم کردہ جنت دیکھ
تیرے سب دروازے ہم پر
اپنے بازو کھول رہے ہیں

صدیوں کی آغوش میں بہتے
دریا آج گواہی دیں
اب کشمیر کے جہلم میں
اور بغداد کے دجلہ میں کچھ فرق نہیں

آج انوکھی بے داری ہے
پہلی کرن سے بڑھ کر اجلے
اور شفاف آغاز کے نغمے
کانوں میں رس گھول رہے ہیں
اے گم کردہ جنت دیکھ
تیرے سب دروازے ہم پر
اپنے بازو کھول رہے ہیں
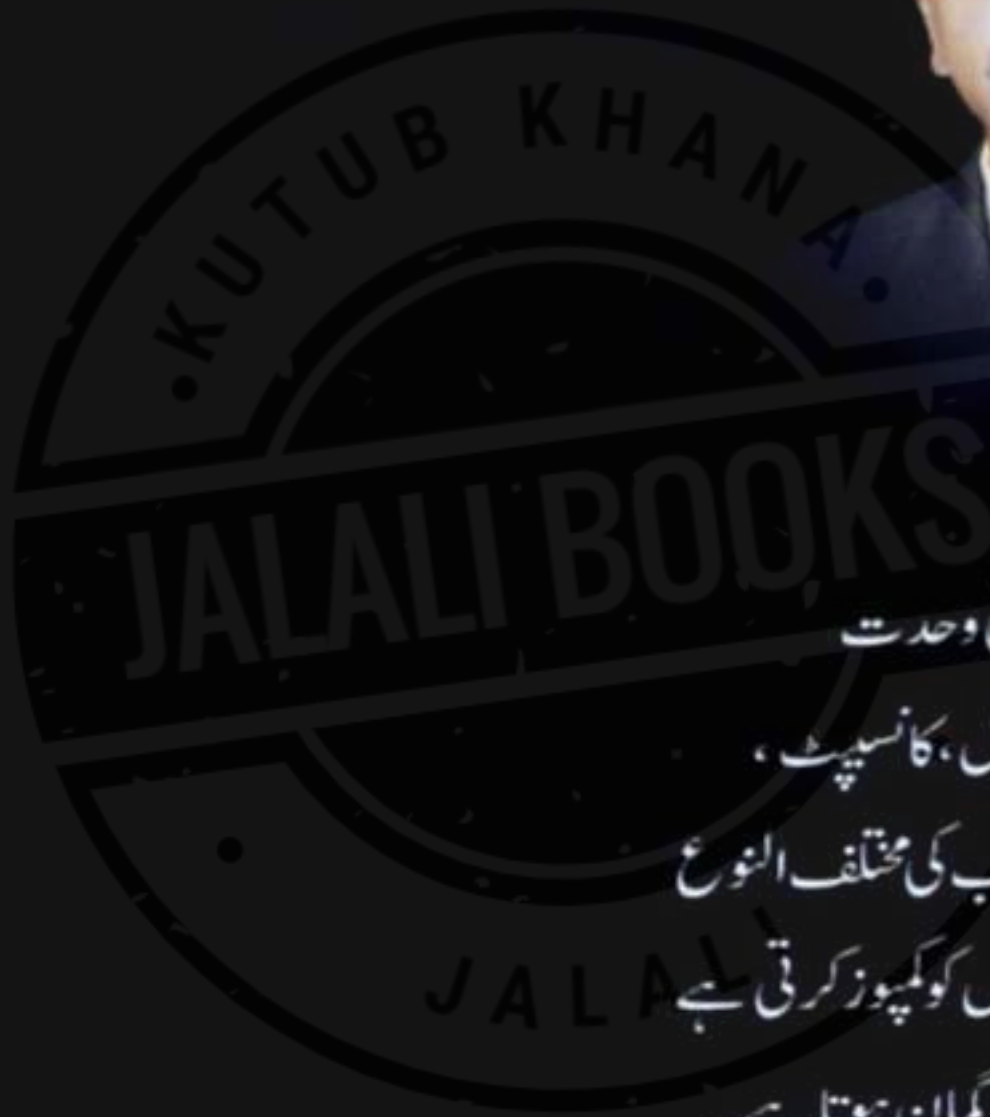
یامین کی نظموں کی نامیاتی وحدت
کچھ اس طرح جذبہ، خیال، کانسیپٹ،
استعاراتی نظام اور اسلوب کی مختلف النوع
اور مختلف الصوت اکائیوں کو کمپوز کرتی ہے
کہ اس پر ایک میلوڈی کا گمان ہوتا ہے۔
یہ مربوط بھی ہے، کیف آور بھی ہے اور بامعنی بھی۔
مجھے امید ہے کہ یامین کی نظموں کو
اردو کی نئی نظم کی slim corpus میں
ایک سودمند اضافہ قرار دیا جائے گا۔

——— ستیہ پال آنند، ڈاکٹر (امریکا)